سیاچن

ایک مختصر تعارف

ڈاکٹر محمد انصار اللہ

Marfat.com
Marfat.com

Collection of Prof. Muhammad Iqbal Mujaddidi
Preserved in Punjab University Library.

پروفیسر محمد اقبال مجددی کا مجموعہ
پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں محفوظ شدہ

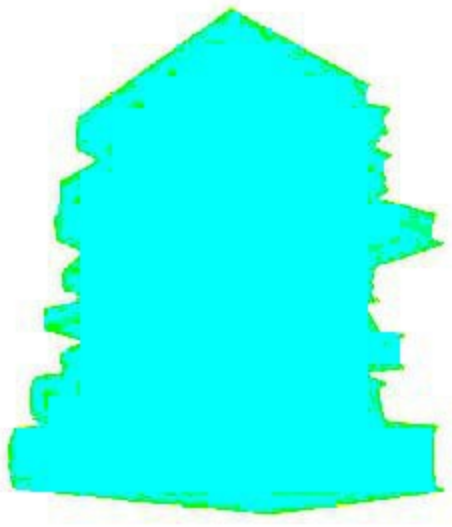

Marfat.com
Marfat.com

Marfat.com
Marfat.com

مخدوم محترم ڈاکٹر محمد اقبال مجددی صاحب کی نذر

محمد انصار اللہ
۲۸/۷/۸۹ء
۴/۵۸۵ سرسید نگر، علی گڑھ

صہبائی

(ایک مختصر تعارف)

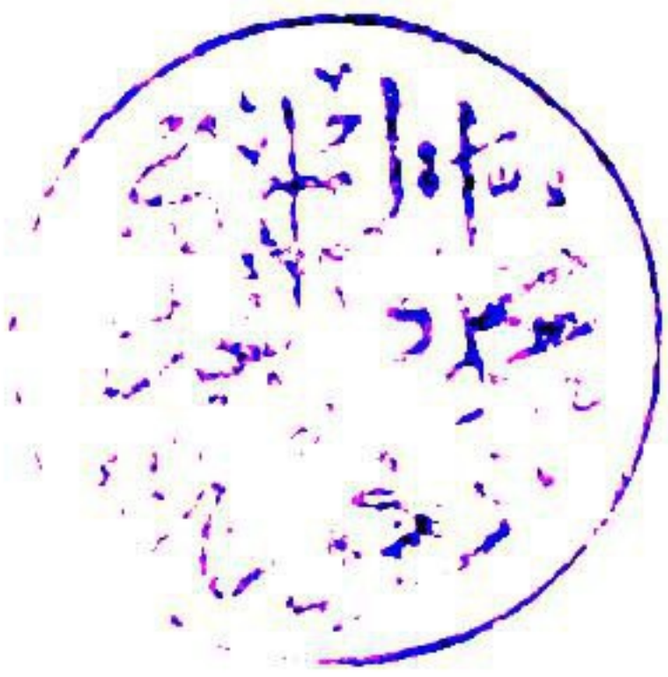

محمد انصار اللہ
(ایم اے، پی ایچ ڈی)
ریڈر، شعبۂ اردو، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ۲۰۲۰۰۱

۱۹۸۶ء

Marfat.com

Marfat.com

یہ کتاب

فخر الدین علی احمد میموریل کمیٹی

حکومت اُتر پردیش، لکھنؤ

کے

مالی تعاون سے

شایع ہوی۔

Marfat.com
Marfat.com

حبیبی و صدیقی

صاحبزادہ سید فضل المتین صاحب چشتی امیری

گدی نشینِ آستانہ عالیہ حضرت خواجہ معین الدین چشتی

کے نام

ع

ساہا در کعبہ و بتخانہ می نالد حیات
تا ز بزمِ عشق یک دانائے راز آید بروں

Marfat.com
Marfat.com

129989

نام کتاب: صہبائی - ایک مختصر تعارف

تعداد: چھ سو

نام مطبع: لیتھو کلر پرنٹرس، علی گڑھ

سالِ اشاعت: ۱۹۸۶ء

ناشر - ڈاکٹر محمد انصار اللہ (مصنف)

قیمت: ساٹھ روپے

ملنے کا پتا

بیت الابصار، ۴/۵۸۵، سرسید روڈ، سرسید نگر

علی گڑھ ۲۰۲۰۰۱

Marfat.com
Marfat.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

شیخ امام بخش صہبائی شہید نے تقریباً چون برس کی عمر پائی۔ اس مختصر سی عمر میں اُنھوں نے فارسی اور اردو نظم و نثر کی چھوٹی بڑی کوئی تین درجن کتابیں لکھ ڈالیں۔ صہبائی کی کئی تصانیف نایاب ہیں۔ بعض کا کوئی سراغ نہیں ملتا۔ کچھ کے صرف نام کا پتا چلتا ہے لیکن دستیاب نہیں ہیں۔ صہبائی شہید کے ایک عزیز ہندو شاگرد منشی دین دیال نے اُن کی جتنی تصانیف مل سکیں، اُن کو یکجا کر کے کلیاتِ صہبائی کی تین جلدوں میں شایع کر دیا اور اِس طرح اُس علم دوست اور استاد پرست شاگرد نے صہبائی کے نام کو بالکل مٹ جانے سے بچا لیا۔ اِس بارے میں کوئی شبہ نہیں کہ اگر جستجو کی جائے تو صہبائی کی بعض تحریریں اور بھی مل سکتی ہیں اور اُن کے حالات میں بھی بہت کچھ اضافے کی گنجایش موجود ہے۔

ڈاکٹر خواجہ محمد حامد صاحب مرحوم وہ پہلے شخص تھے جنھوں نے صہبائی کو باضابطہ طور سے اپنی تحقیق کا موضوع بنایا اور ایک مبسوط مقالہ لکھ کر اُس پر پی ایچ ڈی کی سند حاصل کی، بعد میں اُنھوں نے اُسی مقالہ کو کتابی صورت میں "امام بخش صہبائی۔ شخص، شاعر، شارح" کے نام سے شایع کر دیا۔

موصوف نے ازراہِ علم نوازی اپنی کتاب راقم سطور کو بھی بھیجی تھی جس سے زیرِ نظر کتاب میں پوری طرح استفادہ کیا گیا ہے خیال تھا کہ جب یہ شایع ہو گی تو اُن کی خدمت میں پیش کی جائیگی

Marfat.com
Marfat.com

لیکن افسوس ہے کہ وہ بہت جلد راہیِ ملکِ بقا ہوئے۔ اِنّا لِلّٰہ وَاِنّا اِلَیہِ راجعون۔ اللہ تعالیٰ اُس نیک سرشت، علم دوست، علم نواز بزرگ کے درجات بلند کریں۔ آمین۔

اِن اوراق کا مقصد صہبائی شہید کا مختصر لیکن مرتب اور مبسوط انداز سے تعارف کرانا ہے۔ امید ہے کہ آیندہ کام کرنے والے اِس صاحبِ علم و تصانیف شخص کی علمی اور ادبی خدمات کا زیادہ بہتر اور بھرپور جائزہ پیش کریں گے۔ فقط۔

محمد انصار اللہ

۲۰ رمضان المبارک ۱۴۰۶ھ — بیت الابصار ۴/۵۸۵ سرسید روڈ

۳۰ مئی ۱۹۸۶ء — سرسید نگر، علی گڑھ (یوپی)

Marfat.com

عنوانات

عنوان	صفحہ
وطن، نام، ولدیت	۹
پیر بخش اور اُن کے اعزّا	۱۴
صہبائی کے اقربا اور اولاد	۲۱
علوی سے تلمذ	۲۹
ابتدائی تحریریں	۳۵
وفاتِ اکبر شاہ تک	۵۰
بہادر شاہ کی خدمت میں	۵۸
دلّی کالج میں	۶۲
بہ زبانِ فارسی	۱۰۶
کریم الدین کی جسارت	۱۱۵
آثار الصنادید	۱۲۸
۱۲۶۳ھ/۱۸۴۷ء تک	۱۳۵
تلمذ	۱۴۳
دو حکایتیں	۱۴۹
برائے تربیتِ فرزنداں	۱۵۳

Marfat.com

قولِ فیصل وغیرہ	۱۶۱
ایک معرکہ	۱۶۶
گلستانِ سخن	۱۷۶
۱۲۷۲ / ۱۸۵۵-۵۶ کی تحریریں	۱۹۶
چند اور رسالے	۲۰۰
خاتمہ	۲۰۶
مآخذ	۲۰۵
اشاریہ	
الف:۔ اشخاص	۲۱۶
ب:۔ کتب و رسایل وغیرہ	۲۲۲

Marfat.com

وطن، نام، ولدیت

تھانیسر علاقۂ پنجاب کا ایک قدیمی قصبہ ہے جہاں اُنیسویں صدی عیسوی کے وسط تک ایک رئیس حاکم تھا۔ ۱۸۵۰ء میں اُس خاندان کے آخری حکمراں فتح سنگھ کی بیوہ کے انتقال کے بعد اُس ریاست کو انگریزی عملداری میں شامل کر لیا گیا تھا۔ اب یہ صوبۂ ہریانہ میں واقع ہے۔ اس کے بارے میں بندرابن داس خوشگو نے لکھا ہے:

"پرگنہ تھانیسر کہ در ہند از قدیم جائے عظیم است" (خوشگو ص ۳۵۲)

تھانیسر کی عظمت اور شہرت حضرت عبدالقدوس رودولوی ثم گنگوہی کے اعاظم خلفا میں ایک بزرگ شیخ جلال الدین تھانیسری الکابلی کی نسبت سے ہے جنھوں نے دسویں صدی ہجری/سولھویں صدی عیسوی کے وسط میں یہاں قیام فرمایا تھا۔ شیخ جلال "از جانب پدر و مادر" فاروقی تھے اور کہا جاتا ہے کہ سلسلۂ چشتیہ صابریہ کے مشائخِ متاخرین میں اُن سے زیادہ بزرگ کوی نہیں ہوا۔ شیخ جلال نے ۱۴ ذی الحجہ ۹۸۹ھ / جنوری ۱۵۸۲ء کو پچاسی برس کی عمر میں وفات پائی۔ تاریخ ہوی:

شیخ پاکیزہ دل

Marfat.com

تھانیسر میں شیخ جلال کا روضۂ مبارک مرجعِ خاص وعام ہے۔

شاہ عالم ثانی کے زمانے میں تھانیسر میں شاہ امام بخش نامی ایک بزرگ تھے حکیم قدرت اللہ خاں قاسم نے اُن کے بارے میں لکھا ہے۔

"تھانیسری تخلص شاہ امام بخش تھانیسری است۔ وے دریں بیشے است نیک نہاد، سعادت بنیاد، از سلسلۂ علیۂ قادریہ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کہ نسبتِ ارادت بہ یکے از اولادِ امجادِ حضرت قبلہ شاں قادری قدس سرہٗ دارد و اوقاتِ شبانہ روزی خود در ولیشانہ بسر می آرد۔ گاہ گاہ بطورِ خود شعرِ موحدانہ از طبعش می تراود۔ ایں چہار شعر از وے ست ؎

اِس جہاں میں، اُس جہاں میں کون ہے
ہر نہاں میں ہر عیاں میں کون ہے
ہے جو دکھلاتا تجلّی دمبدم
ہر جمالِ دلبراں میں کون ہے
تو کہے، میں گفتگو سے پاک ہوں
پس یہ گویا ہر زباں میں کون ہے
لوگ کہتے ہیں خدا ہے لامکاں
پھر زمین و آسماں میں کون ہے"

(مجموعۂ نغز ۲/ط ۳۷۹)

اِس اقتباس میں جن بزرگ کو "شاہ قمیشن" لکھا ہے اُن کا صحیح نام "شاہ قمیص" معلوم ہوتا ہے وہ حضرت غوث الثقلین شاہ عبدالقادر جیلانی کے خاندان سے تھے کہتے ہیں کہ سلسلۂ عالیۂ قادریہ[ع] ہندوستان میں اُنھیں

ع احمد شاہ بہمنی نے حضرت شاہ نعمت اللہ (متوفی ۸۳۴ھ / ۱۴۳۱ء) سے فیض پایا

(حاشیہ صفحہ آئندہ میں)

Marfat.com

نے جاری کیا تھا۔ آخر عمر میں بنگال میں جاکر وفات پائی تھی۔ سالِ وفات کے عدد:

قمیص بندۂ خاص / ۹۹۲ (خزینۃ الاصفیا ص۱۳۵ ج۲)

سے برآمد ہوتے ہیں:

شاہ امام بخش تھانیسری کے واسطے سے تھانیسر میں شاہ قمیص کا سلسلہ شاہ علم ثانی کے وقت تک جاری تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اُس مقام پر شاہ امام بخش کی عقیدت عام تھی۔ اُس زمانے میں وہاں کئی بچوں کے نام اُن کے نام پر رکھے گئے۔ اُن میں ایک سے زاید کو شاعر کی حیثیت سے اتنی شہرت ملی کہ اُن کے نام تذکروں میں محفوظ رہ گئے۔ شیخ امام بخش صہبائی بھی جن کا تعارف اِن اوراق میں مقصود ہے اُنھیں میں سے ایک تھے۔ سرسید احمد خاں بہادر نے اُن کے بارے میں اطلاع دی ہے کہ:

"نسب آپ کا والد ماجد کی طرف سے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ تک پہنچتا ہے اور والدۂ مشفقہ کی جانب سے حضرت غوث الثقلین سید عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ تک پہنچتا ہے۔"

(اہلِ دہلی ص۱۳۸)

اِس سے ظاہر ہے کہ شیخ امام بخش کے والد کی شادی سادات میں ہوئی تھی اور اِس طرح صہبائی دونوں سلسلے کی خوبیوں [illegible] کے امین تھے۔ اُن کی طبیعت میں انکساری بھری ہوئی تھی۔ غیر معمو[illegible] کمالات کے باوجود آخر

(حاشیہ صفحہ گزشتہ) تھا لیکن وہ حضرت ہندوستان میں خود تشریف نہیں لائے تھے بلکہ بادشاہ کے لیے اُنھوں نے "تاجِ سبز دوازدہ ترکی" بھجوا دیا تھا۔

Marfat.com

تک وہ خود کو "صہبائیِ ہیچ نشناس" اور "صہبائیِ ہیچمدان و ہیچ میرز" کہتے اور لکھتے رہے۔ یہ بھی اُن کی اسی انکساری کا نتیجہ ہے کہ اُنھوں نے اپنے اہلِ خاندان اور خود اپنے بارے میں کچھ کہنے سے عموماً احتراز کیا ہے چنانچہ اُن کے حالات مفصلاً کچھ معلوم نہیں ہوتے۔ یہ افسوسناک ہے کہ سرسید، کریم الدین قادر بخش صابر اور دین دیال نے نہایت قریبی روابط کے باوجود اُن کے والد کا نام بھی لکھنے کا خیال نہیں کیا۔ یہ محض حسنِ اتفاق تھا کہ اپنی ایک ابتدائی تصنیف "شرحِ معماے ہمدانی" میں صہبائی نے اپنے والد کا نام اِس طرح لکھ دیا تھا۔ "مولانا محمد بخش تھانیسری"

مرزا قادر بخش صابر نے اپنے تذکرے میں صہبائی کے بزرگوں کے بارے میں بس اتنا لکھا ہے کہ:

"حضرت کے آباے کرام و اجدادِ عظام سے اکثر ایسے ہیں کہ اُن کا قامتِ احوال یا لباسِ سربلندیِ ظاہری سے آراستہ تھا یا زیورِ کمالاتِ باطنی سے پیراستہ۔" (گلستانِ سخن ۲/ ص ۳۷)

لیکن اُنھوں نے نہ تو اِس "سربلندیِ ظاہری" اور "کمالاتِ باطنی" کی کیفیت بیان کی اور نہ اُن "اکثر" حضرات کے بارے میں ہی کچھ بتایا جو اِن سے آراستہ و پیراستہ تھے۔ قیاس ہے کہ مولانا محمد بخش تھانیسری اور اُن کے والدین کمالاتِ باطنی سے پیراستہ رہے ہونگے۔ سربلندیِ ظاہری غالباً اُن کو حاصل نہیں رہ گئی تھی۔

مولانا محمد بخش تھانیسری کو اپنے آغازِ شباب میں ہی ترکِ وطن کر کے دہلی آنا پڑا تھا۔ دہلی میں اُن کی اہلیہ بھی مقیم تھیں اور یہیں پر اُن کی اولادیں پیدا ہوئیں۔ بظاہر مولانا محمد بخش کو تلاشِ معاش میں تھانیسر چھوڑنا پڑا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ یہ صورت اُن کے والد کے انتقال کے بعد پیدا ہوئی ہو۔ قراینِ اِس حق

عہ حاشیہ صفحۂ آیندہ پر

Marfat.com

میں ہیں کہ مولانا محمد بخش کو دہلی میں فارغ البالی میسّر نہیں آسکی تھی۔ یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ تھانیسر سے چلے آنے کے بعد بھی اُن کے اخلاف نے کسی نہ کسی طور پر وہاں سے اپنے تعلق کو قائم رکھا تھا۔ ۱۸۵۷ء کے غدر کے بعد اُن کے خاندان کے بچے کھچے افراد انتہائی تباہ حالی میں دہلی سے پھر تھانیسر چلے گئے تھے۔

(حاشیہ صفحۂ گزشتہ)

؎ شاہ عالم بادشاہ کے اوایلِ عہد میں سکھوں نے تھانیسر کو بُری طرح لوٹا تھا جس کے نتیجے میں مسلمان شرفا گھر بار چھوڑ کر وہاں سے نکل پڑے تھے مرزا مظہر جان جاناں نے بھی اپنے ایک خط میں اِس کا ذکر کیا ہے۔" (مقالاتِ شرانی ۳/۵۵)

امکان اِس بات کا ہے کہ مولانا محمد بخش بھی اِسی تباہی کی زد میں آکر ترکِ وطن پر مجبور ہوئے ہوں اور یہی دہلی میں بے سروسامانی کے عالم میں اُن کے بسر کرنے کا سبب ہو۔

Marfat.com

پیر بخش اور اُن کے اعزّا

مولانا محمد بخش تھانیسری کے دو بیٹے تھے۔ دونوں اپنے اپنے فن میں باکمال ہوئے۔ بڑے کا نام پیر بخش تھا۔ وہ حکیم ہوئے۔ چھوٹے صاحبزادے امام بخش تھے جنھوں نے فارسی دانی میں نام پایا۔ اِن دونوں کے نام بظاہر اُس عقیدت کے غمّاز ہیں جو مولانا محمد بخش کو بزرگِ تھانیسر یعنی شاہ امام بخش کے ساتھ تھی۔ مولانا محمد بخش اپنی خاندانی شرافت کے سبب دہلی میں باعزّت بسر کرتے تھے۔ گمانِ غالب ہے کہ سرسید احمد خاں کے بزرگوں سے اُن کے اچھے روابط تھے۔ اِسی کا اثر تھا کہ اُن کی اولادوں میں بھی آخر دم تک اتحاد اور یگانگت کا سلسلہ قایم رہا۔ حکیم پیر بخش کو سرسید نے شاہجہاں آباد کے اُن لوگوں میں شمار کیا ہے جو بقول اُن کے "ہزار ہزار خوبیوں کا مجموعہ اور لاکھ لاکھ ہنروں کا گلدستہ تھے۔" لکھتے ہیں:

> "صاحب ذہنِ رسا، خدیوِ فطرتِ دانا، حکیم پیر بخش خاں، حضرت بادشاہ خلد آرامگاہ محمد اکبر شاہ کی پیش گاہِ عنایت سے بخطاب حکیم دوران مخاطب ہیں۔ سلسلہ نسب کا اُن کے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ تک پہنچتا ہے طرف والد ماجد سے اور حضرت غوث الثقلین سید عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ تک

Marfat.com

طرف والدِ مغفلہ سے اگرچہ وطن آباواجداد کا شہر تھانیسر ہے
لیکن اُن کا مولد و مسکن یہی خاک پاک ہے یعنی حضرت شاہجہاں
آباد حرسہا اللہ عن الفساد۔ تحصیل علم حکیم نصراللہ خاں سے
اور مشقِ نسخہ نگاری اور معالجۂ مرضیٰ حکیم احسن اللہ خاں کی
خدمت میں کی اور اس فن میں دستگاہِ کامل بہم پہنچائی۔
راقم کے ساتھ رابطہ محبت کا برادرانہ سلوک رکھتے ہیں۔ نہ
اُن کے خلق کی صفت بیان میں آسکتی ہے اور نہ کمال کی تعریف
لکھی جاسکتی ہے۔ ایک عرصۂ دراز سے نواب بہادر جنگ رئیس
بہادر گڑھ کی سرکار میں عہدۂ طبابت پر مامور ہیں اور اُس
نواح میں اُن کا وجود مغتنم ہے۔ وہاں کے لوگوں کو اُن کی ذات
سے وہ منافع حاصل ہیں جو نفسِ عیسوی سے بھی متصور نہ ہوں"۔
(اہلِ دہلی ص۵ تا ص۵۱)

حکیم پیر بخش کے اُستاد حکیم احسن اللہ خاں کے ساتھ سرسید کے بھی بہت اچھے مراسم تھے بلکہ خود سرسید اُن کا بڑا محسن تصور کرتے تھے۔ مولانا الطاف حسین حالی نے اُن کے ایک احسان کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

"اُنھوں نے بادشاہ سے سرسید کی تقریب کی کہ اِن کے دادا کا خطاب اِن کو ملنا چاہیے۔ بادشاہ نے منظور کرلیا" (حیاتِ جاوید ص۶۱)

حکیم پیر بخش کے دوسرے استاد حکیم نصراللہ خاں کا ذکر بھی سرسید نے اپنی کتاب آثارالصنادید میں نہایت عمدہ لفظوں میں کیا ہے۔ حکیم نصراللہ خاں کی ایک کتاب "دہ مخزن" کی طباعت کی تاریخ حکیم پیر بخش کے چھوٹے بھائی امام بخش صہبائی نے اِس طرح کہی ہے:

قطعۂ تاریخ ریختۂ خامۂ جادو نگار رشحِ قلم جناب مولوی امام بخش صہبائی دامت افضالہٗ

Marfat.com

چو گشت طبع کتابے کہ ز اول و آخر
بسانِ مرثیہ ہا ہست بابِ درد و حزن
ز روے درد و ملال و قلق پے سالش
۴ + ۴۰ + ۱۰۰ ۱۴۴

بگفت ہاتفِ غیبی کتاب دہ مخزن
+ ۱۱۲۹

۱۲۷۳ =

(جائزہ مخطوطات ۱/ ص ۲۶۸)

یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ مولانا محمد بخش تھانیسری کی اولاد اور سر سید احمد خاں کے اکثر دوست مشترک تھے۔ یہ اشتراکِ دوستی اِن حضرات کی طبیعتوں کی یکسانی اور مزاجوں کی ہم آہنگی کا پتا دیتی ہے۔

مولانا محمد بخش تھانیسری کے اخلاف اور اُن کے اعزا کے حالات تذکروں میں صراحت سے نہیں ملتے۔ صابر اور نساخ نے رحمت تخلص کے ایک شاعر کو صہبائی کا قرابتدار کہا ہے:

"رحمت تخلص رحمت علی، مصنف نالۂ بلبل و انشاے حدیقۂ رحمت و مثنوی شکایتِ فلک، قربتدار و شاگرد مولوی امام بخش صہبائی مرحوم، ہر دو زبان میں شعر کہتے ہیں۔" (سخنِ شعرا ص ۱۸۰)

ایک اور شاعر کا جس کا تخلص خلش تھا، صابر نے اِن لفظوں میں تعارف کرایا ہے:

"خلش تخلص، فردوس علی نام، ماموں زادۂ محمد عبدالحکیم بسمل تخلص، معلوم ہوتا ہے کہ بہت جلد تحصیلِ علم سے فراغت حاصل کر لی۔ دسویں برس میں حفظِ کلامِ ربانی اور اکثر کتبِ نظم و نثرِ فارسی کی تحصیل سے فارغ ہوا۔ فکرِ شعر میں تازہ قدم رکھا ہے اور صاحبزادہ جناب مولوی عبدالکریم سوز سے شعر کی اصلاح لیتا ہے۔" (گلستانِ سخن ۱/ ص ۴۲۹)

Marfat.com

افسوس ہے کہ صابر اور نساخ دونوں نے رحمت علی اور فردوس علی کے والد کا نام نہیں بتایا لیکن دونوں کے ناموں میں جو مماثلت اور مناسبت ہے اُس سے خیال ہوتا ہے کہ فردوس علی اوّل الذکر کا بیٹا یا شاید چھوٹا بھائی ہو۔

فردوس علی کو چونکہ محمد عبدالحکیم کا ماموں زاد بھائی بتایا گیا ہے، یہ یقینی ہے کہ حکیم پیر بخش کی شادی اُس کی پھوپی کے ساتھ ہوئی تھی۔ جیسا کہ فردوس علی اور رحمت علی کے کلام اور حالات سے خیال ہوتا ہے یہ گھرانا بھی مذہب پسند، تعلیم یافتہ اور سخن دوست تھا۔ رحمت اور خلش کی شاعری کے معیار و مزاج کا اندازہ ذیل کے شعروں سے کیا جا سکتا ہے۔

اشعارِ رحمت

دل ہے بیتاب بہت شوخیِ جاناں کی قسم
ہدفِ تیر ہے جاں، کاوشِ مژگاں کی قسم

تیرا ہی کچھ ظہور نرالا جہاں سے ہے
ورنہ یہ رسم ہے کہ بشر سے بشر ملے

نام ایک حرف تھا رونے سے مٹ گیا
خانہ خراب خاک میں یہ چشمِ تر ملے

رحمت یہ عمر اور ورع خیر ہے تجھے
بیٹا تو کیوں لگائے ہے عہدِ شباب کو

اشعارِ خلش

اُس سے مل مل کے دلا دیکھ تو کیا کیا نہ ہوا
ہم کو کیا تیرے ہی کچھ حق میں یہ اچھا نہ ہوا

کچھ اثر تھا نہ آہ سے مقصود
یہ بھی اک طبع آزمائی تھی

ضعف سے لب پہ تھم گئے نالے
ورنہ آفت فلک پہ آئی تھی

کیا مزے سے خلش گذرتی تھی
جب کہ اُس بت سے آشنائی تھی

حکیم پیر بخش کے صرف ایک بیٹے کا حال تذکروں میں ملتا ہے جس کا

---

* رحمت علی رحمت کی مثنویوں کا ذکر بعض جدید مصنفین نے کیا ہے لیکن اُن کے حالات بالکل نہیں لکھے ہیں خود راقم کو اُس کی مثنویاں دستیاب نہ ہو سکیں۔

Marfat.com

نام عبدالحکیم تھا۔ اُس نے شاعر کی حیثیت سے کافی جلدی شہرت حاصل کر لی تھی۔ اُس کا ذکر سب سے پہلے لکھنوی تذکرہ نویس محسن نے کیا ہے:

"بسمل محمد عبدالحکیم ولد حکیم پیر بخش، برادر زادۂ مولوی امام بخش صہبائی باشندۂ شاہجہاں آباد ؎

صبر و قرار و تاب و تواں سب چھٹے رفیق — اک دل یہ رہ گیا ہے سو کیا کیا اٹھائے دل
دل نام کو تھا اپنے سو وہ بھی نہیں ہے اب — مدت ہوئی کہ داغ ہے بر میں بجائے دل"

(سراپا ص ۲۶۱)

محسن کے کوئی دو برس بعد مرزا قادر بخش صابر نے اپنا تذکرہ شروع کیا تو اُس میں بسمل کے لیے بہت تعریفی کلمات استعمال کیے:

"بسمل تخلص گوہر تاج ارجمندی ..... محمد عبدالحکیم فرزند دلبند جالینوس الزماں بقراط دوراں حکیم پیر بخش سلمہ اللہ تعالیٰ ..... فن فارسی میں سلیقۂ معقول حاصل اور تحصیل علم طب میں بجان و جناں مایل۔ جوان وجیہہ، خوش قیافہ، فصیح زبان، صاف دل پاک طینت، ثمرۂ جوانی سے متمتع ..... اللہ تعالیٰ یوماً فیوماً جودتِ ذہنی اور قوتِ طبع میں افزایش کرے۔"

(گلستانِ سخن ۱/۲۹۲)

اس اقتباس کے دعائیہ فقروں سے ظاہر ہے کہ اُس وقت تک بسمل یعنی عمروں میں تھے۔ ظاہراً وہ ۱۲۴۰-۴۲ھ / ۱۸۲۴-۲۷ء میں پیدا ہوئے ہونگے۔ بسمل کے دو شعر اور نقل کیے جاتے ہیں ؎

ہر ہر نگہ میں ناز فروشی ہے کس لیے — اپنا تو اب وہ دل ہی نہیں، جگر نہیں
قاصد پھرا ہے یوں کہ خدا خیر کرے — میری طرح سے کچھ اُسے اپنی خبر نہیں

صابر اور نساخ نے صہبائی کے قرابتدار کی حیثیت سے ایک شاعر غلام احمد حکمت کا بھی ذکر کیا ہے۔ نساخ نے لکھا ہے:

Marfat.com

"نکہت تخلص حافظ غلام احمد دہلوی، قرابتدار و شاگرد مولوی امام بخش صہبائی ؎

بیداری اور خواب ہے یہاں جمع ایک جا — رکھتی ہے تیری آنکھوں میں کیا کیا اثر شراب
اچھا ہوا کہ آنکھوں سے خوں ہو کے بہہ گیا — مدت سے ایک آفتِ جاں تھی بلائے دل"

(سخنِ شعرا ص ۵۳۲)

دونوں تذکرہ نویسوں نے حسب معمول قرابت کی نوعیت نہیں بتائی۔ نکہت کے والد کا نام بھی دونوں نے نہیں لکھا البتہ نساخ کے تذکرے میں نکہت کے ایک بیٹے کا حال اِس طور پر درج ہے:

"نسیم تخلص محمد یعقوب ولدِ حافظ غلام احمد نکہت تخلص، خواہر زادہ عبدالحکیم بسمل شاگرد عبدالکریم سوز ؎

نہ اٹھاؤ نسیم کو در سے — جانیو خاکسار ہے اپنا
ہو گیے خاک ہم ولے ظالم — دل میں تیرے غبار ہے اب تک
کوی نبھتی ہے اِس طرح کہ سدا — اک نہ اک بات پہ لڑائی ہے

(سخنِ شعراء ص ۵۲۱)

شیفتہ کے تذکرے میں نکہت کا حال درج نہیں ہے۔ اُس وقت تک شاید وہ شاعر کی حیثیت سے متعارف نہیں ہو سکے تھے۔ نسیم کے بارے میں نساخ نے جو لکھا ہے اُس سے معلوم ہوتا ہے کہ حکیم پیر بخش کی ایک بیٹی بھی تھی جس کی شادی انھوں نے نکہت کے ساتھ کی تھی۔ اُسی کے بطن سے پیر بخش کا نواسا محمد یعقوب نسیم پیدا ہوا تھا۔

حکیم پیر بخش کے مذکورہ اعزا کی عمروں کی روشنی میں خیال کیا جا سکتا ہے کہ وہ خود ۱۲۱۸ھ / ۱۸۰۳ء کے قریب پیدا ہوئے ہونگے۔ معمولاً استاد کے مقابلے میں شاگرد کی عمر کم ہوتی ہے۔ اِس لیے قیاس کہتا ہے کہ حکیم پیر بخش اپنے استاد حکیم نصر اللہ خاں اور حکیم احسن اللہ خاں سے کچھ چھوٹے ہونگے اِس سے بھی حکیم پیر بخش کے سال ولادت [illegible]

Marfat.com

خیال کو تقویت ملتی ہے۔

تعلیم و تربیت سے فارغ ہونے کے بعد کوی تیس تیئیس برس کی عمر میں حکیم پیر بخش کو اکبر شاہ ثانی کے دربار سے "حکیم دوراں" کا خطاب عطا ہوا۔ امکان ہے کہ یہ اعزاز اُن کو حکیم احسن اللہ خاں کی کوشش سے ملا ہوگا۔ سر سید احمد خاں نے اُن کے نام کے ساتھ کلمہ "خان" کا بھی اضافہ کیا ہے۔ ظاہر ایہ بھی خطاب ہوگا

حکیم پیر بخش کو تصنیف و تالیف اور شعر و سخن سے دلچسپی تھی یا نہیں، اِس بارے میں یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہا جا سکتا البتہ اِس بناء پر کہ اُن کے قریب ترین سبھی اعزا شعر گوی سے دلچسپی رکھتے تھے، قوی امکان ہے کہ اِس فن سے انھیں بھی کم و بیش رغبت ضرور ہوگی۔ ہو سکتا ہے کہ فنِ طب سے متعلق بھی کوی بیاض، رسالہ یا کتاب اُن کی تصنیف ہو۔

مرزا قادر بخش صابر نے اپنے تذکرے میں حکیم پیر بخش کے نام کے ساتھ "سلمہ اللہ تعالیٰ" لکھا ہے۔ یہ اِس بات کی دلیل ہے کہ وہ اس تذکرے کی تالیف یعنی ۱۲۷۱ھ / ۱۸۵۵ء تک زندہ تھے۔ غدر میں موجود تھے یا نہیں، یہ بات کسی ذریعہ سے متعین نہ ہو سکی۔

Marfat.com

صہبائی کے اقربا اور اولاد

غزل کے ایک شعر میں ضمناً شیخ امام بخش صہبائی نے اپنے مولد کی طرف اشارہ کر دیا ہے ؎

دہلی و من ہم ز دہلی لیک ایں بنگر
کہ قطرہ ہم نم و ہم دُر بود یک ابرِ نیساں را

اِس اجمال کی تفصیل مرزا قادر بخش صابر کے تذکرے میں اِس طرح ملتی ہے:

"صہبائی تخلص جناب فیض انتساب حضرت استادی استاد والا نامی قدوۂ کملاے روزگار، اسوۂ افاضلِ شہر و دیار، ماہرِ فنونِ عجیبہ، واقفِ علومِ غریبہ، مخدومی، مولائی، مولوی امام بخش سلمہ اللہ تعالیٰ وطنِ آبائی اُس جناب مستطاب کا شہر کرامت بہر تھانیسر صَانَہَا اللّٰہُ عَنِ الشّر اور مولد گل زمینِ لطافت آئین حضرت شاہجہاں آباد حَفِظَہَا اللّٰہُ عَنِ الفَسَاد ہے"

(گلستان سخن ۲/۱۳۷)

صہبائی کا سالِ ولادت متعین نہیں ہے۔ اپنی ایک کتاب "شرحِ معماے ہمدانی" میں جو اُنھوں نے ۱۲۴۷ھ میں مکمل کی تھی، اپنی عمر کے بارے میں صہبائی نے خود اِس طرح اشارہ کیا ہے:

Marfat.com

"دریں مدت تگاپوی عمر کہ از گلگشتِ خیابان عشرۂ سوم مایل
عشرۂ چہارم است"

اِس میں لفظ "مایل" پر خاص توجہ کی ضرورت ہے۔ اُس وقت تک عشرۂ سوم ختم نہیں ہوا تھا، البتہ عشرۂ چہارم کی طرف مایل ہو گیا تھا۔ یہ صورت چھبیس کے بعد پیدا ہو گی۔ مولوی کریم الدین نے جو صہبائی کے شاگرد بھی تھے، اُن کی عمر کے بارے میں اپنا تخمینہ اِس طرح بیان کیا ہے:

"عمر اُن کی بالفعل اِس سال یعنی ۱۲۶۱ھ میں قریب چالیس کے ہو گی" (طبقات شعرا)

کریم الدین کی اِس تحریر کو صہبائی کے مذکورہ بیان سے مطابق کریں تو اُن کا سالِ ولادت ۱۲۲۰ھ / ۱۸۰۵ء معلوم ہوتا ہے۔ اُن کے بڑے بھائی حکیم پیر بخش اُن سے کوئی دو برس بڑے ہوں گے۔ صہبائی کے بیٹوں کی عمروں پر نظر کریں تو بھی یہی قیاس صحیح معلوم ہوتا ہے۔ ڈاکٹر اسپرنگر اور گارساں دتاسی نے صہبائی کی عمر ساٹھ برس بتائی ہے جو صحیح نہیں۔ اِس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ صہبائی کی صحت اچھی نہیں تھی اور بظاہر اُن کی عمر اچھی معلوم ہوتی ہو گی۔

حکیم پیر بخش کی طرح شیخ امام بخش صہبائی کی شادی بھی اچھے گھرانے میں ہوئی تھی۔ رند تخلص کے ایک شاعر کا ذکر کرتے ہوئے مرزا قلندر بخش صابر نے لکھا ہے:

"رند تخلص ہے نوجوانِ سعادتمند اکرام الدین نام کا کہ مولوی عبدالعزیز عزیز اور مولوی عبدالکریم سوز صاحبزادگانِ حضرت استادی کا ماموں زاد بھائی ہے۔" (گلستانِ سخن ۱/ص ۵۱۶)

نساخ نے اِس کے حالات میں کوئی اضافہ نہیں کیا ہے۔ دونوں تذکروں سے رند کے والد کا نام بھی معلوم نہیں ہوتا۔ بہرحال اتنی بات ظاہر ہے کہ رند کی پھوپی کے ساتھ صہبائی کی شادی ہوئی تھی۔ رند کے چند شعر یہ ہیں:

12999

Marfat.com

تو نے ہماری یاد کو خاطر سے اپنی ہائے — حرفِ غلط کی طرح سے ظالم مٹا دیا
ہم پر تو التفات نہ تھی لیک بزم میں — ساقی نے رند جان کے ساغر پلا دیا

تری زلف بکھری بکھری جو نہ دیکھتے کبھی ہم
تو نہ ہوتے یوں پریشاں نہ یہ حالِ زار ہوتا

نہ وصال اُس سے ہوتا نہ اٹھاتے رنجِ فرقت
جو شراب ہم نہ پیتے تو یہ کیوں خمار ہوتا

مولانا محمد بخش تھانیسری کی شادی خاندان سے باہر ہوی تھی اِس لیے ضروری نہیں کہ اُنھوں نے اپنی اولاد کے رشتوں میں خاندان کی پابندی کی ہو لیکن خود شیخ امام بخش صہبائی مزاجاً چونکہ نہایت اقربا نواز اور خویش پرور شخص تھے قیاس کہتا ہے کہ اپنے بچوں کی شادی اِنھوں نے اپنے رشتہ داروں میں ہی کی ہو گی۔

عبدالغفور خاں نساخ کے تذکرے میں طرب تخلص کے ایک شاعر کے بارے میں تحریر ہے:

"طرب تخلص مولوی رحیم بخش، نواسۂ شیخ نور محمد قادری تھانیسری، مقیم دہلی، شاگردِ عبدالکریم سوز" (سخن شعراء ص ۳۰۴)

لالہ سری رام نے اِس پر اتنا اضافہ کیا ہے:

"کتبِ فارسی مولوی امام بخش صہبائی سے پڑھی تھیں۔ فنِ شعر میں عبدالکریم سوز سے تلمذ تھا۔ غدر کے بعد زندہ تھے اور طبابت کے ذریعے بسر اوقات کرتے تھے۔ ڈیوڑھی صاحبِ دہلی میں اُن کی طرف سے بزمِ مشاعرہ بھی ہوا کرتی تھی۔"
(خمخانہ ۵/ ص ۴۴۱)

طرب کو صہبائی کے قرابتداروں میں شمار کیا گیا ہے۔ صہبائی کی والدہ قادریہ خاندان کی خاتون تھیں، اِس بنا پر خیال ہے کہ شاید طرب اور

Marfat.com

اُن کے نانا نور محمد قادری صہبائی کے ننھیالی رشتہ داروں میں ہوں۔
طرب کے کلام کا نمونہ یہ ہے ؎

آتش مزاجیوں کا نتیجہ ہے مفلسی خالی رہے ہے پنجہ ہمیشہ چنار کا
ہو اے شوق سے اُڑ کر چمن میں پہنچینگے
نہیں سہی ہم اگر بال و پر نہیں رکھتے
بہت ہی ملتی ہے اُس کی طرب سے کچھ صورت
مرا پڑا ہے ترے در پہ اک جواں کیسا
قتل تو کرتا ہے مجھ کو پر میں ہوں برگشتہ بخت
خوف یہ ہے منہ نہ پھیر جائے تری تلوار کا

مختلف مآخذ میں صہبائی کے دو بھانجوں کے نام ملتے ہیں:

وزیر الدین اور قادر علی

دونوں کے ناموں میں جو فرق ہے اُس سے خیال ہوتا ہے کہ شاید یہ دونوں آپس میں خالہ زاد بھائی ہونگے۔ بظاہر وزیر الدین صہبائی کے ایک دوسرے بھانجے اکرام الدین رند کے بھائی ہونگے۔ اِن قیاسوں کی بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ مولانا محمد بخش تھانیسری کے دو بیٹوں پیر بخش اور امام بخش کے علاوہ دو بیٹیاں بھی تھیں۔ ایک بیٹی کی اولاد میں اکرام الدین رند اور وزیر الدین تھے اور دوسری کی اولاد میں مولوی قادر علی تھے۔ سطورِ بالا سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مولانا محمد بخش ایک بیدار مغز، علم دوست اور مذہب پسند انسان تھے اور وہ اِسی قسم کے لوگوں کو پسند کرتے تھے۔

انیسویں صدی عیسوی کے وسط میں صہبائی دہلی کے محلہ کوچۂ چیلان میں رہتے تھے۔ نہیں کہا جا سکتا کہ تھانیسر سے آنے کے بعد اُن کے والد مولانا محمد بخش نے اِسی محلہ میں سکونت اختیار کی تھی یا کہیں اور رہتے تھے۔ بظاہر

Marfat.com

کوچۂ چیلان والا مکان صہبائی کا ذاتی تھا۔ اس بنا پر خیال ہے کہ ابتدا میں مولانا محمد بخش کسی دوسرے مکان میں رہتے ہوں گے جو مختصر اور تنگ تھا۔ کوچۂ چیلان میں صہبائی اپنے مختلف اعزا اور اقربا کے ساتھ رہتے ہوں گے۔ یہ مکان "لمبتا" وسیع رہا ہوگا۔

صہبائی نے اپنی ایک بیٹی کی شادی اپنے بھانجے وزیرالدین کے ساتھ کی تھی یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ اُن کی کوئی اور بیٹی بھی تھی یا نہیں۔ صہبائی اپنے بھتیجے اور بھانجوں کی فلاح اور اُن کی خوبیوں کے خواہاں تھے۔ اُن کی تعریف سے وہ خوش ہوتے تھے مرزا قادر بخش صابر نے اپنے تذکرے میں اِس بات کا بہت خیال رکھا ہے۔

صہبائی کے دو بیٹے تھے اُنھوں نے اُن دونوں کی تعلیم و تربیت میں نہایت کوشش کی تھی اُن کو پڑھانے کے لیے صہبائی نے بعض کتابیں خود لکھی تھیں۔ دونوں بیٹے مذہب پسند، باعلم اور شاعری میں نام آور ہوئے۔ تمام تذکرہ نویس اُن دونوں کی خوبیوں اور صلاحیتوں کے مدّاح تھے۔ بڑے صاحبزادے کا ذکر کرتے ہوئے لالہ سری رام نے لکھا ہے:

"عزیز مولوی محمد عبدالعزیز، مہین پور، مولانا امام بخش صہبائی کے علمی استعداد معقول تھی۔ فنِ سخن میں اپنے پدرِ عالی قدر کے شاگرد تھے۔ ایامِ غدر میں ظفر یاب لشکر کے ہاتھوں بیگناہ شہید ہوئے۔ طبیعت کا رنگ نرالا ہے۔ بہت پُر لطف [illegible] والے شعر کہتے تھے۔ خیالات میں باریکی [illegible]

[illegible]

مرزا فرحت اللہ بیگ نے شیخ محمد ابراہیم ذوق کی زبان سے عزیز کے بارے میں یہ الفاظ کہلوائے ہیں:

"(عزیز کی) غزل سن کر استاد ذوق نے کہا، بھئی صہبائی تمہارا یہ

Marfat.com

لڑکا غضب کا نکلا ہے۔ خدا اِس کی عمر میں برکت دے۔ ایک دن بڑا نام پیدا کرے گا۔ واہ میاں صاحبزادے واہ، کیا کہنا ہے، دل خوش ہو گیا کیوں نہ ہو، ایسوں کے ایسے ہی ہوتے ہیں۔" (دہلی کی آخری شمع ص۸۰)

بھوپال کے نواب صدیق حسن خاں، صہبائی کے عقیدتمند تھے۔ قراین اِس بات کے موجود ہیں کہ وہ عزیز کے ہم سبق رہے ہوں۔ عزیز کے چند شعر یہ ہیں ؎

کٹ کٹ کے خون آتا ہے آنکھوں میں بار بار
خنجر رکھا ہے پہلو میں میرے بجائے دل

نہیں ہے رحم و مروّت جو تجھ میں، خیر نہ ہو
ذرا خدا ہی کا کچھ تیرے دل میں ڈر ہوتا

بیقراری کا کیا سبب ہے عزیز
کہیں دل تو نہیں لگا بیٹھے

وہ نہیں لطف، وہ وفا ہی نہیں
تو تو گویا کہ آشنا ہی نہیں

شیخ امام بخش صہبائی کے دوسرے صاحبزادے مولوی عبدالکریم سوزؔ تخلص کرتے تھے۔ اُن کے ذکر میں مرزا قادر بخش صابر نے لکھا ہے:

"سوزؔ ۔۔۔ کہیں پسرِ حضرت استاد ہیں .... سالِ عمر اِس نونہالِ چمنستانِ کمال کے ہنوز اُنیس بیس سے متجاوز نہیں ہوئے۔" (گلستانِ سخن ۲/ص۲۲)

صہبائی کی تصانیف کی روشنی میں کہ جو اُنھوں نے اپنے فرزندوں کی تعلیم کے لیے لکھی تھیں، خیال ہے کہ گلستانِ سخن کی تالیف (۱۲۷۱ھ/۱۸۵۴ء) تک سوزؔ کی عمر بیس برس سے متجاوز تھی اور اُن کا سالِ ولادت ۱۲۵۰ھ/۱۸۳۴ء کے قریب ہوگا۔ بیس برس کی عمر میں وہ استادی کے درجے کو پہنچ گئے تھے، چنانچہ گلستانِ سخن میں اُن کے بعض شاگردوں کا حال بھی تحریر ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ سوزؔ اپنے بڑے بھائی عزیزؔ کے مقابلہ میں زیادہ

Marfat.com

ذہین تھے اور چودہ پندرہ برس کی عمر میں اُن کے ساتھ شعری اور ادبی تصانیف کے مطالعے کے لایق ہو چکے تھے۔ تذکرہ طورِ کلیم میں ہے کہ سوز عربی سے بھی آشنا تھے۔ لالہ سری رام اُن کے نہایت مدّاح تھے۔ لکھتے ہیں:

"سوز شاعرِ جادو مقال، ناثرِ عدیم المثال، مولوی عبدالکریم سوز خلفِ اصغر و تلمیذِ ارشدِ خسروِ اقلیمِ سخن آرائی حضرت مولوی امام بخش صہبائی، نقادی اور تحقیقاتِ فن کی شہرتِ عام آشنا ہے۔ عربی، فارسی میں صاحبِ تکمیل، منطق، حکمت اور دیگر علوم و فنون میں فارغ التحصیل ..... اپنے کمالات اور ستودہ اخلاق کے باعث یکتائے روزگار، خلیق، بامروت، ملنسار ..... اکثر زمینوں میں بیس بیس غزلیں کہہ کر اپنے شاگردوں سے پڑھوا کے داد لینے میں انجمن سے گوے سبقت لیجاتے۔ خاقانیِ ہند حضرت ذوق کی وفات پر ایک قطعہ تاریخ مسمّٰی بہ واقعۂ تعب خیز

۱۲۷۱

ایسا لاجواب لکھا ہے کہ دیگر صنایع بدایع سے قطع نظر اکثر مصرعوں سے سال و مادہ نکلتا ہے۔ ۱۲۷۴ھ میں تیئیس برس کی عمر پا کر بعالمِ شباب گوروں کے ہاتھ سے بیگناہ مارے گیے ..... اُن کا ضخیم اور قیمتی کلیات لالہ بنارسی داس غمگین کے پاس موجود تھا مگر افسوس کا مقام ہے کہ وہ اُن کی وفات کے بعد ورثا کی کم توجہی سے ضایع ہو گیا۔"

(خمخانہ ۴ ص ۲۰۳)

لالہ سری رام نے سوز کی عمر کے بارے میں صابر کے تخمینہ پر اعتماد کیا ہے۔ اِس میں دوسرے قراین کی روشنی میں ترمیم کی گنجایش موجود ہے۔ سوز کے کلام کا نمونہ یہ ہے ؎

سینکڑوں ہیں تری اس سادہ مزاجی کے نثار + اور قربان ہیں ہم تری ہٹ کے لاکھوں

Marfat.com

جان سینہ میں، نظر آنکھوں پہ، دم ہونٹوں پر
اک نہ آنے سے ترے کام ہیں اٹکے لاکھوں
ایک مژگاں کے تصور سے تری او کافر
خار سے خار تھے سینے میں کھٹکے لاکھوں
مجھ کو ہر کھٹکے پہ گذرا ترے آنے کا خیال
اور شب وعدہ میں ہوتے رہے کھٹکے لاکھوں

شیخ امام بخش صہبائی کے یہ دونوں صاحبزادے اپنے تایا زاد، ماموں زاد بھائیوں، اپنے والد اور دوسرے اعزا، اقربا اور بعض اہل محلہ کے ساتھ غدر میں شہید کر دیے گئے اور اس طرح دہلی کے ایک بے مثال علمی خاندان کا خاتمہ ہو گیا۔ صہبائی کے شاگرد پنڈت دھرم نرائن نے اس سانحہ پر ماتم کرتے ہوئے لکھا ہے:

"آں تشنہ لب زلالِ آمرزش (صہبائی) با ہر دو فرزندِ جگر بند کہ دریائے فضل را موج و کوکبِ سمائے ہنر را اوج بودند در سالِ یکہزار و ہشت صد و پنجاہ و ہفت عیسوی چشم بر رو ے ساقیِ کوثر کشادہ و بیک اجل را لبیکِ اجابت گفتہ، از کوثرِ تسنیم مینا بسر کشید جہانے ماتمی ایں بیداد و علمے دلریش ایں واقعۂ حسرت ایجاد است بنائے سخنوری بہ آب رسید و پارسی دانی در زیرِ بالِ عنقا آشیانہ گزید۔ کاخِ تحقیق از پا در افتاد و گلِ اعتبار از گلبنِ سخندانی بر افتاد۔ علم و ہنر برباد و جہاں آباد خزاں بنیاد شد۔"

(قولِ فیصل ص ۱۶۸)

Marfat.com

علوی سے تلمذ

شیخ امام بخش صہبائی نابینا بادشاہ شاہ عالم ثانی کے آخری زمانے میں پیدا ہوئے تھے۔ زمانۂ طفلی میں انھوں نے اِس بادشاہ کے عہد میں آنکھیں کھولیں۔ پھر جب ہوش سنبھالا تو دہلی کے تخت پر شاہ عالم کے بیٹے ابوالنصر محمد محی الدین اکبر شاہ ثانی کو جلوہ افروز دیکھا۔ اِن کے تعلق سے صہبائی کے دل میں شاہ عالم کے لیے بھی احترام اور عقیدت کے جذبات پیدا ہو گیے تھے۔

جب اِس لایق ہوے تو صہبائی نے اپنے اُن جذبات کے اظہار کے لیے کچھ قطعاتِ تاریخ کہے مثلاً:

"تاریخِ وفاتِ شاہ عالم بہ تعمیہ"

حضرتِ فردوس منزل شاہِ عالم بادشاہ — رفت ازیں دارِ فنا کرد در جنّت مقام
سالِ تاریخِ وفاتِ آں شہِ عالی گہر — دل ز روے نالہ گفتا ہفتمِ شہرِ صیام

۱۱۷۱ + ۵۰

۱۲۲۱ ہجری

عالم شاہزادگی میں "عالی گہر" خطاب تھا، بادشاہ ہونے کے بعد انھوں نے اپنا لقب "شاہ عالم" مقرر کیا۔ مرنے کے بعد "فردوس منزل" خطاب مقرر ہوا۔ مذکورہ قطعہ میں یہ تینوں نام اپنے لغوی معنی کی رعایت کے ساتھ پوری برجستگی سے نظم کیے گیے ہیں۔ تاریخ صوری و معنوی ہے جس کے

Marfat.com

لطف میں "روے نالہ" نے بہت اضافہ کر دیا ہے۔

تاریخِ جلوسِ اکبر شاہ ثانی

به برچو کرد لباسِ خلافت اکبر شاہ — به شرف و دولت و اقبال و عز و نام و س
سروشِ غیب ز روے بدیہہ آں دانا گاہ — جہیز عشرتِ پرویز گفت سالِ جلوس

۱۲۳۰
۱

۱۲۳۱ ہجری

بات "به برچو کرد" سے شروع کی اور "جہیز عشرتِ پرویز" پر تمام کی قطعہ کے ہر لفظ میں اس مضمون کی رعایت موجود ہے "جہیز عشرت" کے اعداد میں رونہ اکہ یعنی النہ ۱۲۳۰ مطلوبہ سال معلوم ہوتا ہے۔ تتمہ کی یہ صورت بہت دلچسپ ہے "آگاہ" کا صرف بھی لائقِ ستایش ہے۔

اُس زمانے تک شاہی کا رعب داب اُٹھ چلا تھا، قدیمی رسمیں البتہ بنا ہی جا رہی تھیں شرافت اور فضیلت کے لیے علم طب سے واقفیت اور فنِ شعر سے شغف کو ضروری خیال کیا جاتا تھا۔ شیخ امام بخش کی شروع کی تعلیم کے بارے میں کوئی بات معلوم نہیں۔ قیاساً کہا جا سکتا ہے کہ اپنے پدرِ والا قدر مولانا محمد بخش تھانیسری سے ابتدائی تعلیم حاصل کی تھی۔ مولانا کی خاندانی وجاہت کا یہ فیض تھا کہ ان کے دونوں بیٹوں کو دہلی کے بہترین استادوں اور عالموں تک رسائی اور اُن سے کسبِ علم کے مواقع میسر آئے۔ اچھے استاد کے لیے شاگرد کے خاندانی تمول یا مفلسی کے مقابلے میں اُس کی شخصی ذہانت اور علم سے رغبت کی بہت زیادہ اہمیت ہوتی ہے۔ مولانا محمد بخش کے دونوں بیٹے اپنے استادوں کی شفقت، عنایت اور محبت کے نتیجے میں اُن کا نہایت احترام کرتے تھے۔

ابتدائی تعلیم و تربیت کے بعد جب شیخ امام بخش اس قابل ہوئے تو

Marfat.com

تحصیلِ علم کی غرض سے مولوی[ع] عبداللہ خاں کی خدمت میں حاضر ہونے لگے۔
مولوی کریم الدین نے لکھا ہے:

"عبداللہ خاں فارسی خواں جو شاہجہاں آباد میں مشہور تھے، اُن سے تحصیلِ فارسی کی اور کتبِ عربیہ بھی متفرق جا بہ جا پڑھیں۔ طب میں بھی دستِ قدرت رکھتے ہیں۔ نفیسی وغیرہ پڑھاتے ہیں۔" (طبقاتِ شعرا)

افسوس ہے کہ مولوی کریم الدین نے اُن "متفرق جا بہ جا" کی تفصیل نہیں بتائی جہاں شیخ امام بخش نے عربی اور طب کی تحصیل کی تھی۔ کسی دوسرے ذریعہ سے بھی یہ بات معلوم نہیں ہو سکی۔ مولوی عبداللہ خاں چونکہ اِن دونوں علوم میں بھی دستگاہ رکھتے تھے، امکان ہے کہ اِس باب میں بھی شیخ امام بخش کی رہنمائی اُنھوں نے کی ہو۔ مولوی عبداللہ خاں کا تعارف کراتے ہوئے سرسید نے لکھا ہے:

"مولوی عبداللہ خاں متخلص بہ علوی، سنِ شریف آپ کا چالیس سے اور کمالِ ظاہری و معنوی ہزار سے متجاوز تھا۔ اگرچہ وطن و مولد شمس آباد تھا لیکن چونکہ ایامِ طفلی سے بود و باش حضرت شاہجہاں آباد میں رہی تھی گویا یہی وطن ہو گیا تھا۔ بہ سبب استعدادِ خداداد

ع لفظ "مولوی" پر توجہ کی ضرورت ہے صہبائی کے وقت میں اِس کا اطلاق شاید اُس شخص پر ہوتا تھا جو دینیات، عربی یا فارسی کا درس دیتا ہو اور مسلمان بھی ہو۔ ہمارے زمانے میں مولوی اُس شخص کو کہتے ہیں جو مذہب پسند ہو اور اپنا وضع بھی اُسی کے مطابق بنائے رکھتا ہو۔ چونکہ مذہبی لوگ نیک عمل اور نیک طبع خیال کیے جاتے ہیں، عوام ہر سیدھے سادے شخص کو بھی مولوی کہہ دیتے ہیں خواہ وہ مذہب پسند ہو یا نہ ہو۔

Marfat.com

کے ہر فن میں یدِ طولیٰ رکھتے تھے خصوصاً نظم و نثر تازی و دری میں اور چونکہ فنِ فارسی میں خواہ بہ اعتبار انشاء نظم و نثر کے خواہ بہ اعتبار درس و تدریس کے

مزاولت بہ کمال اور مشغولی اوقات بہت رہی تھی، اس فن کی نسبت سے شہرت پائی تھی ---- ایک مدت گذرتی ہے کہ شاہجہاں آباد سے بامیدِ تلاشِ معاش دل برداشتہ ہو کر پورب کی طرف تشریف لے گئے ------ چونکہ فنِ طبابت میں معجزۂ مسیحا اور یدِ بیضا رکھتے تھے اُس نواح میں اکثر آدمیوں نے اُن کے علاج کی برکت سے امراضِ صعب سے نجات پائی ---- وہیں ۱۲۶۳ھ میں عالمِ باقی کی طرف راہی ہوئے ---- نظم و نثر سے صفحۂ عالم پر بہت یادگار ہے ---" (اہلِ دہلی ص ۱۳۲)

مولوی عبداللہ خاں کی عمر کے بارے میں سرسید احمد خاں کا تخمینہ بہت صحیح نہیں معلوم ہوتا۔ وہ یقینی طور سے صہبائی سے کافی بڑے تھے اور بوقتِ انتقال اُن کی عمر چالیس سے بہت زیادہ رہی ہوگی۔ عبداللہ خاں فارسی اور اُردو دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے متداول تذکروں میں اُن کا حال مذکور ہے۔ اُن کے اُردو کلام کا نمونہ یہ ہے ؎

مضموں کا فکر کیا کریں اُس کے سخن میں ہم
گم ہیں خیالِ تنگیِ کنجِ دہن میں ہم
دامن سے ڈھانک جیسے کوئی نیچلے چراغ
جاتے ہیں سوزِ عشق لیے یوں کفن میں ہم
کیا دم تھا کل جو دے گئی یارب نسیم صبح
غنچہ کا طرح پھول گئے پیرہن میں ہم

Marfat.com

دل غم سے تنگ، سینہ سراپا الم سے خوں
لائے ہیں بختِ غنچہ مگر اس چمن میں ہم

"حدیثِ قدسی"[عہ] مرتبۂ قاضی محمد عمر مطبوعہ ۱۲۷۹ھ کے صفحہ ۶۳ پر عبداللہ خاں کا خمسہ قدسی کی نعت پر درج ہے جس کا عنوان اس طرح قایم کیا گیا ہے:

عہ راقم نے اپنی کتاب "انتخابِ رغمی" میں یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ اس مشہور نعت کا، جس کا مصرعِ اول یہ ہے ع مرحبا سیدِ مکی مدنی العربی مصنف، شاید سید محمد جان قدسی پدرِ سید علی اکبر ہو۔ یہ قدسی الہ آباد میں مقیم تھا اور صاحب توقیر شخص تھا۔ ۱۲۵۳ھ میں اس کا بیٹا سید علی اکبر پیدا ہوا تو ڈپٹی کلب حسین خاں نادر نے قطعہ تاریخ کہہ کر نذر کیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ جن دنوں مولوی عبداللہ خاں علوی وہاں مقیم تھے اس قدسی کی نعت پر وہاں مسدس اور مخمس کہے گئے تھے۔ عبداللہ خاں نے بھی خمسہ کہا۔ نعت پُر اثر تھی عبداللہ خاں کو بھی پسند آئی ہوگی۔ اُن کے اثر سے دہلی میں بھی اس پر خمسے کہے گئے۔ صہبائی اور اُن کے بیٹے سنہ کے خمسے موجود ہیں۔ دہلی کے لوگ اس سید محمد جان قدسی الہ آبادی سے واقف نہیں تھے۔ اُن تک اس کی نعت عبداللہ خاں کے توسط سے پہنچی تھی۔ عبداللہ خاں مر گیے تو اس کے نام "محمد جان" تخلص قدسی اور نعت کی زبان فارسی کی وجہ سے دلی کے لوگوں نے اسے قدسی مشہدی سمجھ لیا۔ لکھنؤ والے اس سے واقف تھے چنانچہ کلب حسین خاں نادر کے دیوانِ غریب میں اس کے بارے میں ہے:

"قدسی سید محمد جان دختر زادہ شاہ محمد اجمل، باشندۂ دایرہ الہ آباد، صاحب دیوان، شاگردِ حضرتِ آتش" (نادر ص ۱۳۷)

"نظمِ آخریں" میں بھی شامل ہے۔ اس کا عنوان اس طرح ہے:

"مخمس جناب سید علی اوسط صاحب رشک کہ مصارع بر غزل
حاجی محمد جان قدسی (کذا)" (حاشیہ آتش [illegible])

Marfat.com

"خمسہ مولانا مولوی حکیم محمد عبداللہ صاحب رئیس پورہ مفتی ضلع الہ آباد وارد حال دہلی، تخلص علوی" عہ

مولوی عبداللہ خاں علوی کے مکتوبات کا مجموعہ "صفیر بلبل" کے نام سے مرتب ہوا تھا اس کے لیے اُن کے شاگرد امام بخش صہبائی نے چار صفحوں پر مشتمل تقریظ لکھی تھی جس میں عقیدت کا اظہار کرتے ہوئے کہا ہے:

"جلوہ دہِ حسنِ سخن، علوی نادرِ فن کہ تواترِ ایثارِ معنیش در محفلِ استفادہ فرقِ صہبائی را از مشغولیِ سجدۂ شکر فارغ نمی دارد، و زبانِ نیاز ترجمانِ راقم را از سرگرمیِ ادائے سپاس معطل نمی گذارد"

صہبائی اپنے استاد کی تعلیمات کے لیے اُن کے ہمہ وقت سپاس گزار تھے گمان غالب ہے کہ اُن کی صحبت میں رہ کر ہی انھوں نے شعر گوئی شروع کی تھی اور شاید استاد کی پسند کے مطابق اپنا تخلص مقرر کیا تھا۔

(حاشیہ صفحہ گزشتہ)

اس سے پتا چلتا ہے کہ یہ شخص حجِ بیت اللہ شریف سے بھی مشرف تھا۔ اس طرح اس کے اور قدسی مشہدی کے نام میں تمام باتیں بجز وطن کے مشترک ہو گئی تھیں۔

حاشیہ صفحہ ۳۵

عہ یہ عنوان قاضی محمد عمر نے کسی ایسی بیاض سے لیا ہوگا جو عبداللہ خاں کی زندگی میں بلکہ الہ آباد سے واپسی کے فوراً بعد مرتب کی گئی ہوگی۔

Marfat.com

ابتدائی تحریریں

شیخ امام بخش صہبائی نے نظم و نثر میں تصنیف و تالیف کا سلسلہ کب شروع کیا، اس بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ البتہ اُن کی "بیاضِ شوقِ پیام

۱۲۷۲

میں متعدد صفحوں پر مشتمل فارسی نثر میں "دیباچہ بیاضِ اشواق" کے عنوان سے ایک

۱۲۴۶

تحریر شامل ہے۔ اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۲۴۶ھ مطابق ۳۱-۱۸۳۰ء سے پہلے تک فارسی نثر و نظم میں وہ بعض چیزیں لکھ چکے تھے۔ اِن تحریروں کو اُنھوں نے ایک بیاض کی صورت میں جمع کر لیا تھا۔ "دیباچہ بیاضِ اشواق" اِسی کا تاریخی عنوان ہے۔

"بیاضِ شوقِ پیام" میں "دیباچہ بیاضِ اشواق" سے پہلے دو تحریریں اور بھی شامل ہیں یعنی:

تعریفِ روضۂ منورۂ حضرت خلال مکانیؒ

اور

بہارستانِ تخیل

چونکہ "بیاضِ شوقِ پیام" اصلاً خود صہبائی نے مرتب کی تھی، اس لیے صہبائی کو اِس کے قدیمی مشمولات کی ترتیب کو بدلنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ اگر یہ خیال کریں کہ صہبائی نے اِس بیاض میں سب سے شروع

Marfat.com

کی تحریریں زمانی ترتیب سے شامل کی تھیں تو "تعریفِ روضہ" اور "بہارستانِ تخیل" کو ۱۲۴۶ھ سے پہلے کی، یعنی صہبائی کی دستیاب قدیم ترین تحریریں، ماننا پڑیگا۔ "دیباچۂ بیاضِ اخواق" میں صہبائی نے کہا ہے:

"پرتوِ بوقلمونیہائے معنی رنگینش، چہ قدر پیکرِ الفاظ را جلوۂ بال طاؤس بخشیدہ است و تازگیِ الفاظش بچہ رنگ ریشۂ حروف را در کسوت بیرون کشیدہ جلوۂ تاتبسمہائے برقِ تجلی را بدرجۂ شوخیِ حنا سنمشش بخودی پیمائی نگاہ تماشا بمدد دیدۂ دگاہے تاراندۂ رنگینیِ الفاظش بسیرِ شگفتگیہائے گلزارِ خلیل سرمایہ کشید"

اس اقتباس سے دو باتیں سامنے آتی ہیں:

۱۔ صہبائی ۱۲۴۶ھ سے پہلے ہی سجع، مقفیٰ اور مبیّن ظہوری کے طرز میں مرصع اور مغلق نثر لکھنے لگے تھے۔ وہ اس قسم کی نثر کو علمی کارنامہ سمجھتے تھے۔ اسی لیے انھوں نے ابتدائی تحریروں کو بھی محفوظ کر لینے کے خواہشمند تھے۔

۲۔ اس ابتدائی عمر میں انھوں نے تاریخ گوئی میں اچھی استعداد پیدا کر لی تھی۔ چنانچہ دیباچے کے لیے تاریخی عنوان قایم کرنا لایق توجہ بات ہے۔

صہبائی کے استاد عبداللہ خاں علوی کبھی کبھی اردو میں بھی شعر کہہ لیتے تھے لیکن فارسی انشا اور تاریخ گوئی سے شغف نے صہبائی کو اردو شاعری کی طرف متوجہ ہونے کا موقع نہیں دیا۔ یہی وجہ ہے کہ روابط اور دوستانہ مراسم کے باوجود نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ کے تذکرے میں ان کا ذکر شامل نہیں ہے۔

فارسی میں قدرتی طور سے خود نمائی اور حصولِ شہرت کا شوق ہوتا

Marfat.com

شیخ امام بخش صہبائی کی تربیت چونکہ مذہبی ماحول میں ہوئی تھی اور طبعاً وہ سنجیدہ مزاج اور متین شخص تھے۔ اُنھوں نے تھانیسر کے فاروقی اس بزرگ حضرت جلال کے حالات لکھنے کی طرف توجہ کی۔ چونکہ وہ خود بھی اسی سلسلے کے ایک فرد تھے، اِس تحریر سے نوخیز صہبائی کی انا کو تسکین ملی ہوگی۔ بحالتِ موجودہ "بیاضِ شوق پیام" میں اُن کی جو تحریر محفوظ ہے وہ تعریفِ روضہ تک محدود ہے نہیں کہا جا سکتا کہ اُنھوں نے صاحب روضہ کے حالات بھی لکھے تھے یا نہیں جو بھی ہو، اِس موجود تحریر سے بھی صہبائی کی وطن دوستی، بزرگانِ سلف کے کارناموں سے عقیدت اور اپنی نسل کو اپنے شاندار ماضی سے روشناس کرادینے کے جذبے کا اظہار ہوتا ہے۔ صہبائی کی طبیعت کے اسی میلان نے "گلشنِ بیخار"، "آثار الصنادید" اور "آئینِ اکبری" وغیرہ کی تقریظوں میں اُن سے شیفتہ اور سرسید کی مبالغہ آمیز تعریف لکھوالی۔

تعریفِ روضہ کے بعد کی تحریر میں بھی نثر و نظم ملی جلی ہے۔ بصورتِ موجودہ اِس پر کوئی عنوان نہیں تھا۔ ڈاکٹر خواجہ محمد حامد نے اِس کے لیے عنوان "بہارستانِ تخیل" تجویز کیا ہے۔ یہ اِس بنا پر ہے کہ اِس تحریر کا آغاز اس جملے سے ہوتا ہے کہ:

"گل افشانیِ بہارستانِ تخیل عطرِ دماغِ تحیر است ..."

ترتیب میں اِس تحریر کے بعد "دیباچہ بیاضِ اشواق" ہے۔ یہ تینوں تحریریں استعارہ در استعارہ اور خیال در خیال کی صورت میں ہیں اور نوعمر صہبائی کے زورِ تخیل اور ندرتِ بیان کا عمدہ نمونہ پیش کرتی ہیں۔

تصنیف و تالیف کے ساتھ ساتھ شیخ امام بخش صہبائی نے اپنی تعلیم اور مطالعے کے سلسلے کو بھی جاری رکھا لیکن سب سے بڑا مسئلہ معاش کا تھا۔ اِس کے لیے اُنھوں نے معلّمی کو ذریعہ بنایا۔ مولوی کریم الدین نے

Marfat.com

لکھا ہے:

"ابتدا حال اِن کا یہ ہے کہ معلّم گری کیا کرتے تھے۔ بعد مدت مدید کے جب اِن کی محنت اور فارسیت دانی کا غلغلہ شاہجہاں آباد میں بلند ہوا، چند جلے امیروں کے لڑکوں کی تعلیم پر مقرر ہوئے چنانچہ گرد والوں اور بعض متمول کشمیریوں میں چند جا متفرق اِن کے وقت تقسیم ہوئے۔ درس دینا اور خرچ ما یحتاج اپنا سب جا سے تنخواہ پا کر کرنا شروع کیا۔"

(طبقات الشعرا)

معلّمی کے آغاز کے لیے بیس برس کی عمر کافی ہوتی ہے۔ کم و بیش اِسی عمر میں صہبائی نے غریبوں کے بچوں اور اُن لڑکوں کو جو ابتدائی تعلیم کے لیے وہاں کتے پڑھانا شروع کر دیا ہوگا۔ اُس وقت صہبائی جس مکان میں رہتے تھے اُس میں بظاہر اتنی گنجائش نہیں تھی کہ وہاں لڑکوں کو بٹھا کر درس دے سکتے۔ اِس موقع پر سرسید احمد خاں کے والدین نے اِن کی مدد کی۔ مولانا الطاف حسین حالی کا کہنا ہے کہ:

"مولانا صہبائی سے اُن (سرسید) کی دوستی اخوت کے درجے کو پہنچی ہوئی تھی۔ مولانا سے جو طالب علم مکان پر فارسی پڑھنے آتے تھے ابتدا میں وہ سرسید ہی کے مکان پر اُن کو تعلیم دیا کرتے تھے۔"

(حیاتِ جاوید ص ۶۷۶)

اُس وقت سرسید کی عمر نو دس برس سے زیادہ نہیں تھی۔ والدین کے تمام لاڈ پیار کے باوجود اِس کمسنی میں وہ اتنے با اختیار نہیں ہو سکتے تھے کہ اپنے طور پر مکان کا کوئی حصّہ اپنے کسی دوست کو دے دیتے۔ صہبائی کو وہاں تعلیم دینے کی اجازت یقیناً سرسید کے والدین کے دی ہوگی اور اِس باب میں سرسید کی خاطر کے علاوہ مولانا محمد بخش تھانیسری سے اُن کے روابط کو بھی دخل رہا ہو

Marfat.com

شروع زمانے میں جن لوگوں نے صہبائی سے تعلیم پائی تھی، اُن کے حالات تذکروں میں محفوظ نہیں ہیں۔ وجہ ظاہر ہے کہ اُس وقت خود صہبائی کی ابتدا تھی اور اُن کے شاگرد غریب گھرانوں کے بچّے تھے۔ چند سال کے تجربے اور محنت کے بعد جب اُن کی لیاقت اور علمی دیانت کا شہرہ ہوا ہوگا تو امیروں اور رئیسوں نے بھی اپنے لڑکوں کو اُن کے درس میں بھیجنا شروع کر دیا ہوگا، اور بعض کو تعلیم دینے کے لیے اُن کے گھروں پر خود صہبائی کو جانا پڑتا ہوگا۔ صہبائی کے قابلِ ذکر شاگردوں میں میر حسین تسکین پہلے شخص ہیں جن کا حال نواب مصطفا خاں شیفتہ کے تذکرے میں لکھا ہے۔

"تسکین میر حسین، سلسلۂ نسبش بمیر حیدر خاں قاتلِ فرخ سیر میرسید، صاحب فکرِ بلند و اسلوبِ گفتارش دلپسند۔ از حضرت مومن خاں بدرستیِ اشعار پرداختہ، از احباب راقم است"
(گلشنِ بیخار ص۴۲)

شیفتہ نے تسکین کی تعلیم کا حال بیان نہیں کیا ہے البتہ مرزا قادر بخش صابر نے لکھا ہے:

"کتبِ فارسی کو جناب استادی مولوی امام بخش صہبائی سے پڑھا ہے۔"
(گلستانِ سخن ۲/۲۳۷)

صہبائی بھی تسکین کو عزیز رکھتے تھے چنانچہ اپنے "ترجمۂ حدائق البلاغت" میں اِن کے ایک شعر کو اُنھوں نے اِس طرح نقل کیا ہے:

"اِسی قبیل سے یہ شعر میر حسین تسکین کا کہ راقم کے دوستوں میں سے ہے ؎

اب یہ حالت ہے کہ اُن سا بیدرد میرے بچنے کی دعا مانگے ہے

ایسے شخص کا کہ کمالِ بیدرد ہو، ایسے کے حق میں کہ وہ بیدرد اُس کا دشمن بھی بچنے کی دعا مانگا باعتبار عادت کے بعید ہے لیکن

Marfat.com

بہ اعتبار عقل کے ممکن ہے۔"

اپنے شاگرد کو دوست کہہ کر صہبائی نے شاگرد نوازی کی لایقِ تقلید مثال قایم کی ہے۔ اُن کے بعد ڈپٹی کلب حسین خاں نادر نے بھی اپنے "دیوانِ غریب" میں اپنے شاگردوں کو "یکے از دوستان" لکھا ہے۔

میر حسین تسکین شیخ امام بخش صہبائی کے اُن شاگردوں میں سے تھے جن کا تعلق اچھے اور متمول گھرانے سے تھا۔ انھوں نے جلدی ہی خود کو شاعر کی حیثیت سے متعارف کرا لیا اور بالآخر استادی کے درجے کو پہنچ گیے۔ شیفتہ نے اُن کے ایک شاگرد کا ذکر اس طرح کیا ہے:

"عنایت تخلص عنایت علی خاں فرزندِ نواب عبد العلی خاں کوچک برادرِ عباس علی خاں بیتاب، بہ نظمِ ریختہ و فارسی مایل، غزلِ فارسی از نظرِ شیخ امام بخش صہبائی گزرانیدہ و در ریختہ بہ میر حسین تسکین مشورت می نمود، او راست ؎

میں اُس کے دوش سے محفل میں لگ کے بیٹھ گیا
تبھی یہ دیکھ کے اغیار بیحیا نہ اُٹھے"

(گلشنِ بیخار ص ۱۳۷)

عنایت کے بڑے بھائی بیتاب ۱۲۲۷ھ میں اور خود عنایت ۱۲۲۹ھ میں پیدا ہوے تھے۔ بیتاب کے بارے میں شیفتہ نے اطلاع دی ہے کہ وہ ایک مدت تک لکھنؤ میں رہے تھے اور:

"اکنوں چند سالست کہ مایۂ نازشِ جہاں آبادِ ارم تزئین است و باعثِ زینتِ ایں فرخندہ سرزمیں" (ایضاً ص ۳۴)

اگر اس اقتباس میں "چند" کا اطلاق پانچ پر ہوا ہو تو بیتاب کے دہلی آنے کا زمانہ ۱۲۴۵ھ مطابق ۳۰-۱۸۲۹ء کے قریب خیال میں آتا ہے۔ قوی امکان ہے کہ عنایت بھی اُن کے ساتھ آے ہونگے اور اپنے استاد میر حسین تسکین

Marfat.com

کے واسطے سے شیخ امام بخش صہبائی کی خدمت میں پہنچے ہونگے۔ اگر عنایت کے تلمذِ صہبائی کو ۱۲۴۶ھ کا واقعہ خیال کریں تو تسکین اِس سال سے کچھ پہلے سے اُن کے شاگرد رہے ہونگے۔ عنایت نواب زادے اور تسکین امیرزادے تھے۔ اِس طرح "امیروں کے لڑکوں" کے صہبائی کی شاگردی میں آنے کا سلسلہ ۱۲۴۵ھ مطابق ۳۰-۱۸۲۹ء سے کچھ پہلے شروع ہو چکا ہوگا۔ غریبوں کے بچے اس سے اور پہلے سے اُن سے درس لے رہے ہونگے۔

جیسے جیسے صہبائی کو شہرت ملتی جاتی تھی اُن کے شاگردوں کی تعداد میں بھی اضافہ ہوتا جاتا تھا اور اسی کے ساتھ اُن کی یافت بھی زیادہ ہوتی جاتی تھی۔ اِس سے صہبائی کو معاشی اعتبار سے طمانیت حاصل ہونے کے علاوہ علمی کاموں کے کر ڈالنے کا شوق اور حوصلہ بھی زیادہ ہوتا تھا۔ شاگردوں کو درس دیتے وقت وہ علمی مسایل پر نظر رکھتے تھے اور جو مشکل مقام آتے تھے اُن کے حل کے لیے محنت اور کوشش کرتے تھے۔ اُن کے ایک شاگرد مولوی محمد حسین ہجر کا بیان ہے:

"بارہا می دیدم کہ درعین حالتِ تدریس دمے سر بجیب تفکر بردہ شعر یا عبارتے مطلوب بر بیاضے کہ مدام پیشِ نظر بود ثبت می فرمایند و کلکِ جواہر سلکش بر صفحۂ قرطاسے مرقوم می نمایند"۔ (قولِ فیصل ص ۱۶۷)

یعنی جن مسایل کا حل فوری طور پہ ذہن میں نہیں آتا تھا، اُن کو بیاض میں لکھ لیتے تھے اور جب بھی ممکن ہوتا، مطالعہ، غور اور فکر سے اُن کا حل دریافت کرتے تھے اور اس طرح خود اپنے علمی مذاق کو اور اپنے شاگردوں کو مطمئن کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ وہ ایک مثالی استاد تھے اور بقولِ حافظ محمود خاں شیرانی:

Marfat.com

طلبا میں بیحد مقبول تھے۔ اُن کے شاگردوں کی فہرست لمبی ہے۔ اکثر ایسے ہیں جنھوں نے فضیلتِ علمی کے ساتھ ساتھ اچھے عہدے بھی حاصل کیے: (مقالات سرسید ۱۸/ص)

شیخ امام بخش صہبائی اپنے زمانے کے تدریسی مسایل پر غور کرتے تھے اور اُن کا حل تلاش کرتے تھے۔ تجربہ نے اُنھیں بتایا کہ حالات علمی اعتبار سے بھی رو بہ تنزل ہیں اور اب مشکل درسی کتابوں کی شرحوں سے شاگردوں ہی کو فایدہ نہیں حاصل ہوگا بلکہ آیندہ استادوں کے لیے بھی اِس سے مطالعہ اور تفہیم میں سہولت ہو جائیگی۔ صہبائی با صلاحیت اور حوصلہ مند شخص تھے اُنھوں نے پوری تندہی، خلوص، اور لگن کے ساتھ اِس کام کو شروع کر دیا۔ شرح زیلعی کے باب میں اُن کی اہلیت کا بہت جلد اعتراف کیا گیا اور احسن زمانے کے اہلِ علم اُن سے حسب ضرورت مختلف کتابوں کی شرح لکھنے کی فرمایش کرنے لگے۔ منشی دین دیال مرتب کلیاتِ صہبائی نے کہ جو صہبائی کے شاگرد بھی تھے، اُن کی لکھی ہوئی شرحوں سے براہِ راست فیض اٹھایا تھا اِس بارے میں وہ لکھتے ہیں:

"سہل کاری طبعِ مشکل کشائش ابوابِ فہم معانی دقیقہ بر روے اطفالِ دبستان کشادہ، دعالی ہمتیِ خاطرِ فیض پیوندش خوانِ حلِّ مقاماتِ مشکلہ برائے گرسنہ چشمان دقایقِ ہنر نہادہ ---- در شفاخانۂ صحت بخشیہا سقم لغاتِ واضح محتاجِ نوشدارو ے تحقیقِ اوست و در میکدۂ کیفیت طرازیہاے شرحِ مقاماتِ مصنف جگر تشنۂ صہبائے تدقیقِ او ---- : قتِ طبعش مشکلاتِ کلام اساتذہ را آسان کردہ، کاوشِ اندیشہ اش از معدنِ دقایق جواہرِ حقایق را سہل بر آوردہ" (کلیاتِ صہبائی ۱/ص۸۶)

Marfat.com

صہبائی کی پہلی معلوم یا قاعدہ کتاب "شرحِ معمائے نصیرائے ہمدانی" اکیاون صفحوں پر مشتمل ہے۔ اِس کو انھوں نے کہیں شرحِ معمائے ہمدانی کہیں شرحِ نصیرائے ہمدانی اور کہیں حلّ مقاماتِ انشائے نصیرائے ہمدانی کہا ہے۔ شروع کے ایک رسمی دیباچے کے بعد انھوں نے چھبیس صفحوں کی تمہید میں "معمّا" کی تعریف اور اُس کے اصولوں کا بیان کیا ہے۔ اِس کے بعد اُن مقاموں کی تشریح کر دی ہے، جہاں مجھے ہیں اِس کام کو انھوں نے ۱۲۴۷ھ مطابق ۳۲-۱۸۳۱ء میں مکمل کر لیا تھا۔ خاتمے میں دو قطعاتِ تاریخ "در تمام و ختم اختتام این سطور" کے عنوان سے لکھے ہیں۔ دوسرے قطعے کا مصرعۂ تاریخ اِس طرح ہے:

ہاتفِ غیب گفت خاموش شو

۱۲۴۷

شرحِ معمائے ہمدانی کی تکمیل کے بعد معلوم نہیں شیخ امام بخش صہبائی پر کس قسم کی پریشانی آئی کہ اُنھیں ترکِ وطن پر مجبور ہونا پڑا۔ شاید مولانا محمد بخش حقانیہ ری کا انتقال ہو گیا ہو اور اِس وجہ سے صہبائی مالی مشکلات میں گھر گئے ہوں۔ تلاشِ روزگار میں وہ دہلی سے نکل کر مین پوری تک گئے۔ یہ نہیں معلوم کہ اُنھوں نے مین پوری کا رُخ کیوں کیا تھا۔ شاید وہاں کوئی علم دوست رئیس ہو گا جس سے صہبائی کو قدر کی توقع پیدا ہوئی ہو گی۔ وہاں پہنچ کر اُنھیں شدید مایوسی سے دوچار ہونا پڑا۔ تقریباً ایک برس تک وہ تنہائی، بیکسی اور بیماری میں مبتلا رہے۔ آخر جب طبیعت کو ذرا سکون ہوا تو اپنی تازہ ترین

۱؎ خواجہ نصیر الدین نصیرائے ہمدانی سلطان جلال الدین محمد اکبر کے عہد میں ہندوستان میں آیا تھا۔ محمد قلی قطب شاہ کے درباریوں کو نکتہ چینی جا کر منظم [illegible]

Marfat.com

سماے ہمدانی کا اُنھیں پھر خیال آیا۔ اِس کے خاتمے میں اُنھوں نے اپنی سرگذشت لکھ ڈالی۔ ڈاکٹر خواجہ محمد حامد کے لفظوں میں اِس کا خلاصہ اِس طرح ہے:

"۱۸۴۵ء میں اِس رسالے کو مکمل ہوے ایک سال ہو چکا تھا اور صہبائی کو اُس کا دل گلستانِ فراغت میں لگیا تھا کہ یکایک فکرِ معاش نے اُس کا دامن اختیار کھینچا چنانچہ اُس نے اُس گوشۂ عافیت سے پاؤں باہر نکالا جو راحتِ زندگی کو غنیمت جاننے والوں کی جاے پناہ ہوتا ہے۔ دل کو تکالیفِ سفر اُٹھانے پر آمادہ کیا اور شاہجہاں آباد کی خاک پاک سے جدا ہونے پر نالہ کناں ہوا۔ آخر وقت کے تقاضے سے سرزمینِ مین پوری میں وارد ہوا اور غریب الوطنی میں مبتلا ہونے کی صعوبت سے اور بالخصوص اِس خطّے کے لوگوں کی بے اعتنائی سے نظم و نثر کے خیالات ذہن سے نکل گیے۔"

(امام بخش صہبائی ص ۵۹)

اپنے استاد مولوی عبداللہ خاں کے نام ایک خط میں بھی صہبائی نے مین پوری میں نظم و نثر کی ناقدری کا ذکر کرتے ہوے لکھا ہے کہ یہاں یہ حال ہے کہ اگر کچھ لکھو تو اُسے خود ہی پڑھو اور خود ہی سنو۔ اُن کے الفاظ یہ ہیں:

"دریں روزہا کہ خاکِ مین پوری خاک بر سرِ آرزوہاے افشاند، اگر سایۂ خدامِ آقاے فیض التزام بالِ ہمے بر سرِ عقیدت سرشت وا می نمود، وحشت افزاے ایں سوادِ بر ہما تقاضاے گریباں چاکی می افزود۔ اگر ضرعے موزوں می تواں کرد ہم لب ہاے خود را بہ صلۂ آں مامور گردانیدن است و اگر عبارتے باید نگاشت ہم گوشِ خود را سامع

Marfat.com

آں بہم رسانیدن"۔

یہ بات دیکھنے کی ہے کہ ایسے حوصلہ شکن حالات میں بھی اُس فنافی العلم شخص کا حال یہ تھا کہ اپنے استاد سے اُن کی غزل یا شوق سے لکھی ہوی نثر کی فرمایش کرتا ہے کہ بقول اُس کے "ضیافتِ طبع" کا اِس سے بہتر سامان نہیں ہو سکتا۔

"اگر بوسیلۂ مخلص نواز ارسالِ یک دو غزل را ضیافت طبع۔ دوستدار تصوّر نمایند از نتایجِ کرم است و عنایت عبارت نثری کہ اتفاقِ تقاضاے شوق باعث بر تحریرش گردیدہ باشد ہم موجبِ روشن سوادیہاے شوق است"۔

اِن حالات میں صہبائی نے ایک برس سے کچھ زاید مدت بسر کی۔ ناچار واپسی کا خیال کیا۔ "نواب حیدر حسن خاں بہادر رئیس شاہجہاں آباد" کے نام کہ جن سے مراسلت کے ذریعے رابطے کی صورت پیدا ہو گئی تھی، ایک خط میں لکھا ہے:

"بعد از اوقاتے کہ گردشِ آسیاے دوراں آدم وار در تلاشِ مشتِ گندمی آوارۂ خاکِ ہندوستاں نمودہ، در عالمِ بے اختیاری مجبور قناعت گزیں ہاے روزی تنگ دارد، کم وقتے است کہ عزمِ وطنِ مالوف ناخنے بر سینۂ آرزو نہ زدہ باشد، امّا نامساعدیہاے روزگار پاے در دامن شکستہ را نخواست کہ ہم آغوشی نقش لمحۂ از سرِ خود باز کردہ براہ افتد۔"

مین پوری کے زمانۂ قیام میں شیخ امام بخش صہبائی کو جو مصیبتیں اُٹھانی پڑیں، اُن سے قطع نظر، صہبائی کو ایک بڑا علمی فایدہ یہ حاصل ہوا کہ اُنھوں

Marfat.com

نے مختلف دوستوں کے نام جو خط لکھے، دہلی کے قدر شناسوں نے اُن کو محفوظ کر لیا اور بالآخر اُن کے مجموعے سے صہبائی کی ایک نثری کتاب "انشائے مکاتیب" تیار ہو گئی۔ شرح معمائے ہمدانی کی قبولیت نے صہبائی کی ہمت بڑھائی۔ دلی آنے کے بعد اُنھوں نے ظہیرائے تفرشی کی کتاب "شبنم و شاداب" کی شرح کا آغاز کیا۔ اپنی کتاب کو اُنھوں نے "شرح ظہیرائے تفرشی" کہا ہے اور اُس کے دیباچے میں ابنائے زمانہ کی ناسزاواری اور اہل ہنر کی ناقدری کا شکوہ کیا ہے لیکن اُس میں نہ تو شدائد سفر کا ذکر ہے اور نہ وطن سے دوری و مہجوری کا بیان۔ اِس بنا پر خیال کیا گیا ہے کہ یہ شرح صہبائی نے دہلی آنے کے بعد لکھی تھی۔ شرح شبنم شاداب کا دیباچہ ۱۲۴۹ھ مطابق ۱۸۳۳ء میں لکھا گیا ہے اِس لیے گمان ہے کہ صہبائی ۱۲۴۷ھ کے وسط میں مین پوری گئے اور ۱۲۴۸ھ کے آخر تک دہلی واپس آ گئے ہونگے۔

صہبائی کے خطوں اور دوسری تحریروں نے اُن کی انشا پردازی کا ثبوت فراہم کیا تو شرحوں نے اُن کی فارسی دانی اور عبارتِ نظم و نثر کی تفہیم کی صلاحیتوں کو خاص و عام سے منوا لیا۔ دہلی کے علمی حلقوں میں عام طور سے وہ احترام کی نظروں سے دیکھے جانے لگے۔ اِس صورتِ حال نے بعض لوگوں کو حسد میں مبتلا کر دیا۔ کچھ ستم ظریف، بے فکرے ان کے علمی انہماک کا مذاق بنانے لگے اور تعلیم و تعلّم میں بے پناہ لگن کے سبب اُن کے سامنے علمی مسایل چھیڑ کر اپنی منہ زوری سے بحث کرنے لگتے اور لطف لیتے تھے۔ اِس سلسلے کا ایک واقعہ صہبائی نے خود بھی بیان کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

"ایک مرتبہ دوستوں کی صحبت میں جہاں مدّعیانِ سخن بھی موجود تھے، اُن (نظیری کے دو) شعروں پر بحث ہو

لہ ملا ظہیرائے تفرشی بن ملا مراد گیارھویں صدی ہجری / سترھویں صدی عیسوی کا صاحب قلم تھا۔ باغ و بہار (شبنم و شاداب) [illegible] ایک اہم تصنیف ہے۔

Marfat.com

پڑی۔ میں کچھ کہتا تھا اور دوسرے لوگ کچھ گپ ہانکتے تھے۔ حیرت اس پر تھی کہ بعض حاضرینِ مجلس مجھ سے اعتقادِ جاہلانہ سے اُن کے مُنہ کو تکتے تھے اور بغیر کچھ سوچے سمجھے اُن کی تعریف و تصدیق کرتے تھے حالانکہ میں اپنی بات کے رد کیے جانے پر آزردہ ہو رہا تھا لیکن چونکہ خود کو حق بجانب سمجھتا تھا میں نے اپنی گفتگو کو جاری رکھا۔ اگرچہ اب میری گفتگو اُس شد و مد کے ساتھ نہیں تھی کیونکہ وہاں نہ میرا کوئی دوست تھا، نہ حق گذار، نہ کوئی سخن فہم تھا، نہ منصف۔ اِس موقع پر اُس بزم میں ایک بزرگ وارد ہوئے اُنھوں نے دیکھا کہ چند زبان دراز بحث میں مجھ پر چھائے ہوئے ہیں اور مجھے خیرہ کیے ہوئے ہیں۔ اُنھوں نے انصاف دوستی اور معنی فہمی کی رو سے میری پشت پر ہاتھ رکھا اور کہا کہ تم نے گفتگو کا حق ادا کر دیا۔ اگر یہ لوگ نہیں سمجھتے تو تمھیں کیا۔ پھر اُن نامنصفوں کی طرف مخاطب ہو کر جاہلوں کو بہت شدت سے اور جہالت کیشوں کو شوکتِ زبان سے خاموش کر دیا۔"

(امام بخش صہبائی ص۶۸)

یہ واقعہ صہبائی نے اپنے رسالہ "نتایج الافکار" میں قلمبند کیا ہے جس کا تعارف آگے آئیگا۔ اِس واقعہ سے پتا چلتا ہے کہ جہاں بعض "جہالت کیش" اُن کی نیک طبعی کی وجہ سے اُن کو ستاتے تھے وہیں دہلی میں کچھ بزرگ ایسے بھی تھے جو صہبائی کی علمیت کی، اُن کی کم عمری کے باوجود قدر کرتے تھے اور اپنے رعب و شوکت سے جاہلوں کی زبانوں کو بند کر دیتے تھے۔ اِسی واقعہ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ صہبائی کے یہاں علمی معاملوں میں

Marfat.com

ایسی خود اعتمادی پیدا ہو چکی تھی کہ وہ مخالفوں کے مجمع میں گھر جانے کے باوجود اپنی بات کو جاری رکھ سکتے تھے۔ وہ طبعًا نیک نفس واقع ہوئے تھے اور دل سے چاہتے تھے کہ دنیا سے بہالت کو دور کر دیں۔

نواب مصطفا خاں شیفتہ نے اپنا تذکرہ گلشنِ بیخار سنہ ۱۲۵۰ھ مطابق ۱۸۳۴ء میں مکمل کیا تھا۔ اس کے لیے صہبائی کے استاد عبداللہ خاں علوی اور خود صہبائی نے بھی تقریظ لکھی تھی۔ شیفتہ نے اِن دونوں تحریروں پر جو عنوان قایم کیے ہیں وہ اِس طرح ہیں:

"عبارتے کہ یگانۂ زمانہ عبداللہ خاں متخلص بہ علوی زینت افزائے ایں اوراق کردہ اند۔"

اور:

"عبارتے کہ مولوی امام بخش صہبائی تخلص بقلم آوردہ اند۔"

تذکرہ نویسی کا کام جیسا کہ ذکر کیا جا چکا، صہبائی کے مزاج سے مطابقت رکھتا تھا۔ پھر شیفتہ سے اُن کے مراسم بھی تھے چنانچہ اپنی تقریظ میں کہ جو نثر و نظم کا ایک طلسم ہے شیفتہ کی مبالغہ آمیز تعریف کی ہے۔ مذکورہ عنوان میں شیفتہ نے استاد (علوی) اور شاگرد (صہبائی) کے علمی مراتب میں فرق کو قایم رکھا ہے۔ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ شیفتہ کی نظر میں صہبائی کی تحریر اتنی وقیع تھی کہ اُنھوں نے اپنے تذکرے کے لیے زینت کا سبب خیال کر کے اسے اُس میں شامل کیا۔

حکیم قطب الدین باطن نے شیفتہ کے تذکرے کے جواب

Marfat.com

میں اپنا تذکرہ گلستانِ بیخزاں کے نام سے لکھا۔ اُس میں اُنھوں نے بہ شمولِ شیفتہ سات ایسے نام بتائے ہیں جن کی وجہ سے وہ تذکرہ "ذلیل" ہو گیا ہے لیکن اُنھوں نے اشارے کنایے میں بھی ایسا کوئی فقرہ نہیں لکھا جو صہبائیؔ کے خلاف تو کجا، اُن کے واسطے نامناسب بھی ہوتا، بلکہ عنایت کے ذکر میں باطن نے صہبائیؔ کے لیے اچھے کلمات کا استعمال کیا ہے۔ اِس سے پتا چلتا ہے کہ صہبائیؔ کی شخصیت دوست اور دشمن سب کے نزدیک محترم تھی۔

Marfat.com

وفاتِ اکبر شاہ تک

شیخ امام بخش صہبائی کی عمر کا زیادہ حصّہ عسرت، تنگدستی اور پریشان حالی میں بسر ہوا تھا۔ اِس کا نقصان یہی نہیں ہوا کہ اُن کی بیشتر تصانیف زیورِ طبع سے آراستہ نہیں ہو سکیں بلکہ خود اُن کی زندگی میں اُن کی بعض تحریریں دوسرے شخص کے نام سے چھپ کر مشتہر ہو گئیں۔ اُن کی شہادت کے بعد اُن کی کتابوں کی حفاظت کون کرتا؟ اُن کے ایک عزیز شاگرد منشی دین دیال نے جب کلیاتِ صہبائی کی پہلی جلد شایع کی تو اُس کی تقریظ میں یہ عرضداشت بھی شامل کی کہ:

"از تلامذۂ صہبائی و دیگر صاحبانِ علم اُمید است کہ اگر کتابے از کتبِ مذکورہ بالا نزدِ شاں باشد، بہ عاریت دادنش خاکسار را مرہونِ منت پندارند و رہینِ احسان شمارند۔"

لیکن تمام تر کوششوں کے باوجود قلمی ہی نہیں، صہبائی کی تمام مطبوعہ کتابیں بھی اکٹھا نہ کی جا سکیں چنانچہ اُن کی تمام کتابیں کلیاتِ صہبائی میں شامل نہیں ہیں۔

Marfat.com

"شرحِ شبنم شاداب"، کی تکمیل کے بعد شیخ امام بخش صہبائیؒ نے فارسی کے ایک ہندو عالم ٹیک چند بہار کی تصانیف کی طرف توجہ کی۔ بہار دہلی کے رہنے والے تھے۔ ۱۱۸۰ھ مطابق ۶۷-۱۷۶۶ء میں فوت ہوئے۔ اپنی فارسی لغت "بہارِ عجم"، کی بدولت انھوں نے شہرتِ دوام حاصل کرلی ہے۔ اُن کی بعض قابلِ قدر تصانیف اور بھی ہیں انھیں میں ایک رسالہ "جواہر الحروف" بھی ہے جس کے مشمولات حسب ذیل ہیں:

"مقدمہ در حروفِ تہجیِ فارسی
باب اول - در حروفِ مفرد
باب دوم - در حروفِ صلہ
خاتمہ - در حذفِ رابطہ"

صہبائیؒ نے اِس رسالے کے حل طلب مقاموں کی تشریح پر مشتمل ایک رسالہ لکھا اور اُس کا نام "رسالہ حلِّ مقاماتِ جواہر الحروف"، مقرر کیا۔ یہ رسالہ اب نایاب ہے البتہ صہبائیؒ کے ایک دوسرے رسالے میں جو سہ نثرِ ظہوری کی شرح میں ہے اِس کا ذکر ایسے سے لیا۔ مقاموں پر آیا ہے مثلاً:

"وایں را در رسالہ حلِّ مقاماتِ جواہر الحروف بہ تفصیل نوشتہ ام"

اور:

"و دریں باب کلام طویل الذیل است، در حلِ مقاماتِ جواہر الحروف بالاستیعاب گفتہ ام"

اِس نایاب رسالے کا ذکر صہبائیؒ کی ایک دوسری کتاب "شرحِ حسن و عشق"، میں بھی موجود ہے۔ اِس طرح:

"و وایں در رسالہ حلِ مقاماتِ جواہر الحروف بہ تفصیل

Marfat.com

ایہ ادیافتہ "

چونکہ شرحِ حسن و عشق کا آغاز ۱۲۵۰ھ میں ہوا تھا، رسالہ حلِ مقاماتِ جواہر الحروف یقینی طور سے اِس سال سے پہلے لکھا گیا ہوگا۔ قیاساً اُس کا سالِ تصنیف ۱۲۴۹-۵۰ھ مطابق ۱۸۳۳ء مانا جا سکتا ہے۔ اقتباساتِ بالا سے یہ بھی خیال ہوتا ہے کہ اِس رسالے میں صہبائیؒ نے بعض بحثیں مفصل کی تھیں اور وہ ایسی تھیں کہ زمانۂ مابعد میں بھی صہبائیؒ اُن پر اضافے کو ضروری نہیں سمجھتے تھے۔ کلیاتِ صہبائیؒ کی پہلی جلد میں اِس رسالے کا صرف دیباچہ شامل ہے اور اُس کا عنوان اِس طرح قائم کیا گیا ہے:

"دیباچۂ حلِ مقاماتِ نسخۂ جواہر الحروف ٹیک چند بہار"

اِس دیباچے کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ اِس رسالے میں صہبائیؒ نے جواہر الحروف کے بعض مقاموں کا حل پیش کرنے کے علاوہ چند فوائد کا اپنی طرف سے بھی اضافہ کیا تھا۔ اسی میں صہبائیؒ نے یہ ذکر بھی کیا ہے کہ جواہر الحروف کے جس نسخے سے استفادہ کیا ہے وہ مصنف کا دستخطی ہے۔ کہتے ہیں:

"ٹیک چند بہار در نسخۂ اولِ جواہر الحروف کہ یک باب و نیمے است و بدستخطِ مصنف بنظر رسیدہ و فقیر آنرا نسخہ گرفتہ" (کلیاتِ صہبائیؒ ۲/ ص۳)

یہ اہم بات ہے۔ اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ صہبائیؒ صحتِ متن پر بھی نظر رکھتے تھے اور اِس نکتہ کو اچھی طرح سمجھتے تھے کہ تحقیقی معاملوں میں کس حد تک کے نسخوں پر اعتماد کیا جا سکتا ہے۔ صہبائیؒ کے اِس تحقیقی مزاج کا عکس اُن کے حاضر خرد اور دوست سرسید احمد خاں کے یہاں بہت نمایاں ہے۔

Marfat.com

معلوم ہوتا ہے کہ صہبائیؔ کے رسالے حلِّ مقاماتِ جواہر الحروف کو اہلِ علم نے بہ نظرِ استحسان دیکھا اور اُن سے رسالہ جواہر الحروف کی ایک مختصر سی شرح لکھ ڈالنے کی بھی فرمائش کی۔ صہبائیؔ نے دوستوں کی اِس فرمائش کو بھی پورا کیا۔ کہتے ہیں:

"در حینے کہ حلِّ مقاماتِ جواہر الحروف در عہدِ کارسازیہائے خامۂ عجز نگار دست آویزی بے استعدادیہائے صہبائی را آمادہ بود و ۔۔۔۔ ناگزیری اجابتِ سوالِ احبّا باعث گردید کہ در سلکِ چند از عالم اختصار عبارت سیاہ سازد۔"

اِس طرح ایک دوسرا رسالہ وجود میں آیا لیکن یہ بھی پہلے رسالے کی طرح نایاب ہے اور اب اِس کا صرف دیباچہ کلیاتِ صہبائیؔ کی جلد اول میں اِس عنوان سے محفوظ ہے۔

"دیباچۂ شرحِ مختصر جواہر الحروف"

اگرچہ یہ شرح مختصر تھی، اِس کا دیباچہ تین صفحوں پر محیط ہے، جب کہ پہلے رسالے کا دیباچہ صرف ایک صفحہ کا ہے۔ دونوں رسالوں کے اِن دیباچوں میں سالِ تصنیف کی طرف کوئی اشارہ موجود نہیں ہے لیکن اوپر جو عرض کیا گیا اُس سے ظاہر ہے کہ "حلِّ مقامات" کے فوراً بعد صہبائیؔ نے "شرحِ مختصر" لکھی ہوگی۔

مولوی کریم الدین نے اِسی سلسلے کی شیخ امام بخش صہبائیؔ کی ایک اور تصنیف کا پتا دیا ہے۔ لکھا ہے:

"شرح الفاظِ مشکلۂ ٹیک چند بہار کی بھی ان (صہبائیؔ) کی تالیف سے درمیان اِسی سال یعنی ۱۸۴۶ء کے چھپی ہے۔" (طبقات الشعرا)

Marfat.com

اب تک اِس نام کی صہبائیؔ کی کوئی مطبوعہ یا قلمی تصنیف دستیاب نہیں ہوسکی ہے اِس لیے یقین کے ساتھ تو نہیں کہا جا سکتا کہ یہ اول الذکر دو رسالوں میں سے ایک ہے یا اُن سے مختلف کوئی تیسرا رسالہ یا کتاب ہے مولوی کریم الدین نے سالِ طباعت ضرور بتا دیا ہے لیکن سالِ تصنیف کی طرف اشارہ نہیں کیا ہے۔ اگر یہ خیال کریں کہ چھپنے سے کچھ ہی دن پہلے یہ کتاب مکمل ہوئی تھی تو اِسے اول الذکر دونوں رسالوں سے مختلف ماننا پڑیگا۔ مولوی کریم الدین نے اِس مطبوعہ کتاب کا نام بھی مختلف بتایا ہے۔ اِس سے بھی مذکورہ خیال کو تقویت ہوتی ہے۔

کہا جا چکا ہے کہ صہبائیؔ کی لکھی ہوئی شرحیں طالب علموں کے حلقے سے نکل کر اُس زمانے کے صاحبانِ علم میں مقبول ہونے لگی تھیں اور اب اُن سے اِس قسم کے کاموں کی فرمائشیں کی جانے لگی تھیں۔ اِس صورتِ حال نے اُن کے حوصلوں میں بلندی اور قلم میں روانی پیدا کی۔ ۱۲۵۱ھ مطابق ۱۸۳۵-۳۶ء تک اُنھوں نے تین کتابیں لکھ ڈالی تھیں۔ ان میں پہلی کتاب نعمت خان عالیؔ کی مثنوی "حسن و عشق" کی شرح ہے۔ صہبائیؔ کا کہنا ہے کہ حسن و عشق کی کسی شرح کے لکھے جانے کا دور و نزدیک کہیں کے لوگوں سے سراغ نہیں ملا اور:

"در اثنائے تسوید حلِّ مقاماتِ جواہر الحروف بعضے از دوستانِ واثق دستِ خواہش در دامنِ صہبائیؔ زدند"

اِس لیے وہ "دوستانِ واثق" کی خواہش پوری کرنے کے لیے آمادہ ہوئے اور ۱۲۵۰ھ میں غالباً "حلِّ مقامات" کی تکمیل کے فوراً بعد انھوں نے اِس کام کو شروع کر دیا۔ "آغازِ امر" اِس کی نہایت برمحل تاریخ ہوئی۔ اِس شرح کی تکمیل پر صہبائیؔ نے کم و بیش ایک برس

Marfat.com

صرف کیا۔ تکمیل کی صوری و معنوی تاریخ انھوں نے ذیل کے مصرعے سے کہی ؎

یوم چہلم شنبہ سویم من شعبان

۱۲۵۱

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس شرح کی تکمیل سے صہبائی کو ۳ شعبان ۱۲۵۱ھ مطابق ۲۴ نومبر ۱۸۳۵ء کو فرصت ہوئی۔ ایک دوسرے مصرع تاریخ میں انھوں نے کتاب کی تصنیف کا مقصد بیان کیا ہے ؎

یاد باد اشرح وصل حسن و عشق

۱۲۵۱

یعنی شرح نگار چاہتا ہے کہ اس شرح کے واسطے سے مثنوی کے مطالب کو سمجھنے اور یاد کرنے میں سہولت ہو۔ شرح کے خاتمے میں صہبائی نے علم و ہنر کی بے قدری کا شکوہ بھی کیا ہے۔ یہ شرح دہلی میں ۱۸۴۲ء میں پہلی بار چھپی تھی۔

شیخ امام بخش صہبائی جسمانی اعتبار سے دھان پان تھے۔ عمر اگرچہ کچھ زیادہ نہیں ہوئی تھی، مسلسل محنت اُن کو تھکا دیتی تھی۔ ایک کتاب مکمل کرنے کے بعد چاہتے تھے کہ آرام کریں لیکن دوستوں کا اصرار کسی نئے کام کے لیے شروع ہو جاتا تھا۔ وہ معذرت کرتے تھے لیکن عذر مسموع نہیں ہوتا تھا۔ ناچار نئے کام کا آغاز کر دیتے تھے۔ "شرح معمائے جامی" کے دیباچے میں لکھتے ہیں،

"شرح حسن و عشق سے فارغ ہوتے ہی، احباب کا تقاضا ہوا کہ معمائے جامی کی شرح لکھوں۔ میں نے معذرت چاہی مگر سوال پر نہیں ہوئی۔ مجبوراً دوم شعبان کو شرح کا آغاز کیا۔ تاریخ آغاز ہی سے برآمد ہوتی ہے

دوم شہر شعبان مبارک

۱۲۵۱

(امام بخش صہبائی ص ۱۷۱)

Marfat.com

اس موقع پر یہ بات توجہ طلب ہے کہ ۲ شعبان کو صہبائی نے شرح جامی کا کام شروع کر دیا تھا لیکن شرح حسن و عشق کا خاتمہ انھوں نے ایک دن بعد یعنی ۳ شعبان کو مکمل کیا تھا۔ اس سے صہبائی کے اس بیان کی تائید ہوتی ہے کہ اس نیے کام کے لیے احباب اصرار کر رہے تھے اور پہلے کام کی تکمیل کے بعد انھیں آرام کرنے کا موقع بالکل نہیں مل سکا تھا۔

"شرح معمائے جامی" کی ابتدا میں صہبائی نے معما کی تعریف بیان کی ہے اور اس سلسلے میں جامی اور دوسرے استادوں کے اقوال بھی نقل کیے ہیں۔ اس ابتدائی بحث کے بعد انھوں نے "معمائے جامی" کی تشریح قلمبند کی ہے۔ یہ رسالہ مختصر ہے اور کل اٹھائیس صفحوں پر مشتمل ہے۔

شرح معمائے جامی کی تصنیف کے دوران شیخ امام بخش صہبائی کو صنعتِ معما میں خود بھی تصنیفی کام انجام دینے کا خیال پیدا ہوا انھوں نے غور و فکر کے بعد اس صنعت میں اپنی رباعیوں کا ایک مجموعہ تیار کر دیا۔ اس مجموعے کا تاریخی نام انھوں نے "جواہر منظوم" مقرر کیا۔

1251

اس میں کل ایک سو تیس رباعیاں ہیں جن میں سے ایک خود شاعر یعنی صہبائی کے نام سے متعلق ہے۔ دوسری اس کے تخلص اور تیسری اس مجموعے کے سالِ تصنیف کے بارے میں ہے۔ باقی رباعیوں سے خدا کے ننانوے نام برآمد ہوتے ہیں آخر میں تین صفحوں پر مشتمل ایک طویل قطعہ درج ہے جس کا عنوان یہ ہے:

"قطعہ مشتمل بر استخراجِ اسم اللہ از علی و بالعکس بہ اجرائے اعمالِ معما"

اس رسالے کا ایک قلمی نسخہ جو ۱۲۶۰ھ مطابق ۱۸۴۴ء کا لکھا ہوا ہے بنارس ہندو یونیورسٹی کے کتبخانے میں محفوظ ہے۔

Marfat.com

صہبائی کی کتاب "جواہر منظوم" نہایت مقبول ہوی چنانچہ وجیہ الدین خاں معنی دکنی نے اپنے رسالے "معمیات" میں اس کا انتخاب شامل کیا تھا۔

۱۲۵۲ھ مطابق ۱۸۳۶ء کی لکھی ہوی صہبائی کی کوی کتاب تا حال ہمارے علم میں نہیں ہے لیکن اس بارے میں شبہ نہیں ہونا چاہیے کہ اس سال میں بھی تصنیف کے اس دریا کا فیض جاری رہا ہوگا اور کوی نہ کوی کتاب یا رسالہ نثر یا نظم میں ضرور وجود میں آیا ہوگا۔ صہبائی کی تصانیف کو جو شہرت اور قبولیت حاصل تھی اس کے پیش نظر یہ بات بھی قرین قیاس نہیں معلوم ہوتی کہ ان کو اکبر شاہ ثانی کے دربار میں باریابی حاصل نہیں ہوی تھی، خصوصاً جب کہ ان کے بڑے بھای حکیم پیر بخش کو بادشاہ کے مزاج میں دخل رہا ہے اور ان کو سرکار شاہی سے خطاب بھی ملا تھا لیکن اس سلسلے میں کوی بات ہمارے علم میں نہیں آسکی ہے۔

عہ سید عارف نوشاہی نے اس بارے میں لکھا ہے:

معمیات از وجیہ الدین خاں معنی دکنی۔ وے پسر یکے از درباریان آصفجاہ سوم بود و نزد شاہ محمد حسن محو صوفی طریقہ عبداللہی آموزش دیدہ بود و خود نیز سراینده عارف بود و غالب دہلوی اشعار او را دوست میداشت۔ دیوان او در دست است۔

در این رسالہ معماہا و حل آنہا را از گلدستہ نزاکت تالیف قاضی اسماعیل مہری و جواہر منظوم سرودہ صہبائی دہلوی انتخاب کردہ است۔" (فہرست موزہ ملی پاکستان ص ۴۶۸)

Marfat.com

بہادر شاہ کی خدمت میں

بروز جمعہ ۲۸ جمادی الثانی ۱۲۵۳ھ مطابق ۲۸ ستمبر ۱۸۳۷ء کو بعد نماز مغرب اکبر شاہ ثانی کا انتقال ہوا۔ اُن کی جگہ اُن کے صاحبزادے میرزا ابو ظفر سراج الدین محمد بہادر شاہ ثانی کے لقب سے تخت نشین ہوئے۔ شیخ امام بخش صہبائی نے قطعۂ تاریخ کہا ؎

از نشۂ دولتِ بہادر شاہی — شد پُر ز مے طرب ایاغِ دہلی
بنشست بتختِ دولتِ روز افزوں — نزہت بفزود از دماغِ دہلی
تاریخِ جلوسِ آں شہِ والا قدر — آمد بلبِ خرد چراغِ دہلی

۱۲۵۳

؎ بہادر شاہ کے جلوس کی تاریخیں بہت کہی گئی ہونگی لیکن صہبائی کی کہی ہوئی یہ تاریخ ایسی بے ساختہ تھی کہ اس سے اگر توارد نہ ہوتا تو عجب ہوتا چنانچہ کرامت علی اظہر نے بھی اسی سے تاریخ نکالی ؎

از یمنِ جلوسِ خسرو عہد — افزود بہارِ باغِ جہاں
گر فکر تراست بہرِ تاریخ — اظہر تو بگو چراغِ دہلی

۱۲۵۳

اور کے بعد جب بہادر شاہ نے وفات پائی تو معمولی سے اضافہ سے تاریخ کہی گئی۔ جلوس ان کا چراغِ دہلی سو اب یہ دیکھو مطابق اس کے [illegible] رحلت کہا بجھا ہے چراغِ دہلی

۱۲۷۹

Marfat.com

اس قطعۂ تاریخ سے پتا چلتا ہے کہ صہبائی کو اس زمانے میں بادشاہ کی خدمت میں رسوخ حاصل تھا۔ انھوں نے اپنے بادشاہ کی مدح میں ایک نثری رسالہ "ریزۂ جواہر" کے نام سے لکھ کر پیش کیا۔ اس کے سالِ تصنیف کے اعداد اس صورت میں کہ جب ہمزہ کا ایک عدد بھی شمار میں لیا جائے "سہ نثر ریزۂ جواہر" سے برآمد ہوتے ہیں۔

۱۲۵۳

سر سید احمد خاں نے اس رسالے کے بارے میں لکھا ہے:

"ایک نثر مسمّٰی بہ ریزۂ جواہر سلطان [illegible] محمد سراج الدین بہادر شاہ خلد اللہ ملکہ و سلطنتہ کی مدح میں اس آب و تاب کے ساتھ ریختۂ قلم نزاکت رقم کی ہے کہ اگر رشک و حسدِ ہم عہدی چشم پوش نہ ہو تو اس کی جلوہ گاہ میں سہ نثر ملا نور الدین ظہوری کو ہرگز پردۂ خفا سے جلوہ گر نہ کریں اور ظہوری کو اس کے عہد میں خفائی بنا دیں۔"

اس رسالے کی [illegible] یہ ہے کہ ظہوری [illegible] "گلزارِ ابراہیم" [illegible] اپنے بادشاہ ابراہیم [illegible] تھی اور اس کو نو صفتوں سے متصف [illegible] کی اتباع میں اپنے بادشاہ بہادر شاہ ثانی کی [illegible] ہے یعنی:

معرفت ، اتباع شریعت ، [illegible]

عیش و عشرت ، سخاوت ، شجاعت

عدالت

Marfat.com

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ صہبائی نے ریزۂ جواہر میں زمانے کی ناقدری کا شکوہ بہت پُر درد انداز سے کیا ہے لکھا ہے کہ:

"صہبائی کی فصاحت کا اس قدر شہرہ ہے پھر بھی سوسن (جو خود بے زبان ہے) اس کو عجزِ بیان کا طعنہ دیتی ہے اور اس کی دور بینی کا اتنا آوازہ ہے تب بھی نرگس (جو خود بے بصر ہے) اس کو بے بصری کا الزام لگاتی ہے"

یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ اس بیان کے باوجود بادشاہ نے صہبائی کی اس علمی پیشکش کی قدر کس طور پر کی اور انھیں کس قسم کی عنایات سے سرفراز کیا۔

کلیاتِ صہبائی کی پہلی جلد میں سب سے پہلے اسی رسالے کو جگہ دی گئی ہے اور مرتب کلیات نے اس رسالے کے مضمون کی تصریح میں لکھا ہے:

"نظم و نثر نہایت پاکیزہ بعبارتِ رنگین بطرزِ بسہ نثرِ ظہوری در مدحِ سراج الدین بہادر شاہ"

یہ رسالہ صفحہ ۶ سے شروع ہو کر صفحہ ۵۲ پر تمام ہوا ہے۔ اس کے حاشیے پر "فرہنگِ ریزۂ جواہر" ہے۔ یہ فرہنگ بھی صہبائی ہی کی کاوشِ فکر کا نتیجہ ہے اور اس سے بھی اُن کے علم و فضل کا ثبوت ملتا ہے۔ بہادر شاہ کے حالات و معاملات سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے صہبائی کے رسالہ "ریزۂ جواہر" کا مطالعہ بھی افادیت سے خالی نہیں ہے۔

بہادر شاہ ثانی کے بادشاہ ہونے کے بعد اعتماد الدولہ نواب حامد علی خاں بہادر وزیرِ اعظم ہوئے۔ شیخ امام بخش صہبائی

Marfat.com

کی تصانیف سے قطع نظر، اُن کی تدریسی صلاحیتوں اور خوبیوں سے متاثر ہو کر اُنھوں اپنے لڑکوں کی تعلیم و تربیت کے لیے ان کو کیا۔ مولوی کریم الدین نے لکھا ہے:

"رفتہ رفتہ نواب حامد علی خاں بہادر کی سرکار میں اُن کے لڑکوں کے پڑھانے کے واسطے (صہبائی) مامور ہوے۔"

(طبقاتِ شعرا)

اس تقرر سے صہبائی کی عسرت اور تنگدستی میں کمی ضرور آئی ہوگی لیکن مالی اعتبار سے اُن کی پریشانیوں کا سلسلہ ختم نہیں ہوا البتہ اُن کی شہرت میں بہت اضافہ ہوا۔ ترقی کی راہیں کھل گئیں۔ یہ بات یقینی ہے کہ ان حالات میں اُن کے قلم کی روانی زیادہ ہو گئی ہوگی لیکن تعجب ہے کہ بہادر شاہ کے جلوس کے ابتدائی دو تین برسوں کی اُن کی کوئی تصنیف اب دستیاب نہیں ہے۔

Marfat.com

دِلّی کالج میں

ابھی بہادر شاہ بادشاہ کا تیسرا سال جلوس ختم نہیں ہوا تھا کہ شیخ امام بخش صہبائی کے پیروزگار کی ایک ایسی صورت پیدا ہو گئی جو اگرچہ اُن کے مزاج سے پوری طرح مطابق تھی لیکن اِس سے پہلے اُس کا تصوّر بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ مولوی کریم الدین ناقل ہیں

"جس برس میں کہ لفٹنٹ گورنر بہادر یعنی طامسن[1] صاحب جو کہ عالم کامل اور قدر شناس اہلِ علوم کے ہیں شاہجہاں آباد میں واسطے بندوبست مدرسہ کے تشریف لائے سب مدرسوں کو مع طلبا کے امتحان لے کر یہ تجویز کی کہ ایک مدرس فارسی مدرسہ کے واسطے اچھا مستعد مقرر کرنا چاہیے۔

شاہجہاں آباد میں سے لوگوں [illegible] کی تلاش (کذا) ہوئی۔ مفتی محمد صدر الدین خاں بہادر نے [illegible]

---

[1] (James Thomason) علم دوست شخص تھا اس کی فرمائش پر گلزاری لعل نامی ایک شخص نے "تواریخ ضلع بریلی" لکھی تھی

Marfat.com

زمانے میں شاہجہاں آباد کے صدر الصدور ہیں جناب طامین صاحب بہادر کی خدمت میں عرض کی کہ اِس شہر میں سا اچھے فارسی داں تین شخص منتخب روزگار ہیں؛ ایک مرزا نوشہ صاحب، دوسرے مولوی امام بخش صاحب، تیسرے حکیم محمد مومن خاں۔ لفٹننٹ گورنر بہادر نے تینوں کو بلوایا۔ مرزا نوشہ صاحب نے بہ سبب اس کے کہ اُن کو نوکری کرنے سے استغنا تھی انکار کیا۔ حکیم محمد مومن خاں نے درخواست ایک سو روپیہ ماہواری تنخواہ کی کی۔ مولوی امام بخش صاحب نے چونکہ کسی طرح کا وسیلہ بجز روزگار کے وجہ معیشت نہ رکھتے تھے حسب خواہش لفٹننٹ گورنر بہادر کے حکم اجابت کی۔ چالیس روپیہ ماہواری ان کے واسطے مقرر ہوا۔ مدرسہ اول فارسی خواں کے مقرر ہوئے۔ سنہ ۱۸۴۶ء میں درس و تدریس کرنے لگے۔ اُن کے روزگار کے باب میں اور لوگوں نے بھی بہت سعی کی تھی یہ نکہ وہ شخص اسی عہدہ کے قابل تھا۔ بعد ایک عرصہ کے پچاس (۵۰) روپیہ تنخواہ ہو گئی۔ ہنوز وہی پاتے ہیں۔ شاہجہاں آباد کے مدرسے میں پڑھاتے ہیں۔" (طبقات الشعرا)

مولانا محمد حسین آزاد نے اس واقعے میں مرزا اسد اللہ خاں غالب سے متعلق بعض پُر لطف باتوں کا اضافہ کر کے اس کو رنگین بنا دیا ہے لکھتے ہیں:

"سنہ ۱۸۴۲ء میں گورنمنٹ انگلشیہ کو دہلی کالج کا انتظام

Marfat.com

از سرِ نو منظور ہوا۔ ٹامسن صاحب جو کئی سال تک اضلاع شمال مغرب کے لفٹننٹ گورنر بھی رہے اُس وقت سکرٹری تھے۔ وہ مدرسین کے امتحان کے لیے دلّی آئے اور چاہا کہ جس طرح سو روپے مہینے کا ایک مدرسِ عربی ہے ایسا ہی ایک فارسی کا بھی ہو۔ لوگوں نے چند کاملوں کے نام بھی بتائے۔ ان میں مرزا کا نام بھی آیا۔ مرزا صاحب حسب الطلب تشریف لائے۔ صاحب کو اطلاع ہوی مگر یہ پالکی سے اتر کر اس انتظار میں ٹھہرے کہ حسب دستورِ قدیم صاحب سکرٹری استقبال کو تشریف لائینگے۔ جب کہ وہ نہ اُدھر سے آئے نہ یہ اِدھر سے گئے اور دیر ہوی تو صاحب سکرٹری نے جمعدار سے پوچھا۔ وہ پھر باہر آیا کہ آپ کیوں نہیں چلتے؟ انھوں نے کہا کہ صاحب استقبال کو تشریف نہیں لائے، میں کیونکر جاتا؟ جمعدار نے جاکر پھر عرض کی۔ صاحب باہر آئے اور کہا کہ جب آپ دربارِ گورنری میں بہ حیثیت ریاست تشریف لائینگے تو آپ کی وہ تعظیم ہوگی لیکن اس وقت آپ نوکری کے لیے آئے ہیں، اُس تعظیم کے مستحق نہیں۔ مرزا صاحب نے فرمایا کہ گورنمنٹ کی ملازمت باعثِ زیادتیِ اعزاز سمجھتا ہوں نہ یہ کہ بزرگوں کے اعزاز کو بھی گنوا بیٹھوں۔ صاحب نے فرمایا کہ ہم آئین سے مجبور ہیں۔ مرزا صاحب رخصت ہو کر چلے آئے۔

صاحب موصوف نے مومن خاں صاحب کو بلایا۔ اُن سے کتاب پڑھوا کر سُنی اور زبانی باتیں کر کے اسی

Marfat.com

روپیہ تنخواہ قرار دی۔ اُنھوں نے سو روپے سے کم منظور نہ کیے۔ صاحب نے کہا سو روپے لو تو ہمارے ساتھ چلو اُن کے دل نے نہ مانا کہ دلّی کو ایسا ست بیچ ڈالیں۔" (آب حیات ص۴۸۷ تا ص۴۸۸)

آزاد کے اس بیان میں کئی باتیں محلِ نظر ہیں:

۱۔ مولوی کریم الدین کے قول کے مطابق یہ واقعہ ۱۸۴۰ء کا ہے۔ مولوی عبدالحق نے بھی اسی کو صحیح مانا ہے (مرحوم دہلی کالج ص۱۵۲) دہلی اردو اخبار سے بھی اسی کی تائید ہوتی ہے۔ اس میں ۷ جون ۱۸۴۰ء مطابق ربیع الثانی ۱۲۵۶ھ کو یہ خبر شایع ہوئی ہے کہ:

"مسٹر جی ٹامسن صاحب بہادر سکرتر گورنمنٹ شمال و مغربی اضلاع کے ہوے۔"

اپنے اس تقرر کے بعد ہی اُنھوں نے مدرسۂ دہلی کے لیے مدرّسِ فارسی کا انتخاب کیا تھا۔ آزاد نے اس واقعہ کے لیے جو سال لکھا ہے وہ درست نہیں ہے۔

۲۔ آزاد کا کہنا ہے کہ اصلاً مدرسِ فارسی کی تنخواہ وہی تجویز ہوئی تھی جو مدرّسِ عربی کی تھی یعنی سو روپے لیکن یہ بات کریم الدین نے نہیں کہی کریم الدین کے بیان کے مطابق مومن نے سو روپے طلب کیے تھے جو منظور نہ ہوے۔

۳۔ آزاد کے بیان میں "دستورِ قدیم" کا مطلب یہ ہوا کہ مدرسۂ دہلی میں اور صاحب سکرٹری کے پاس مرزا آتے جاتے رہتے تھے۔ یہ بات قرینِ قیاس نہیں۔ اسی طرح یہ بات بھی ہے کہ یا تو سکرٹری صاحب

Marfat.com

آئین سے اتنے مجبور تھے کہ استقبال کو نہ آسکے یا پھر ایسے آزاد ہوئے کہ جواب بعد ادا سے کہلوانے کے بجائے خود پہلے آئے۔ پھر جب وہ آہی گئے تو مرزا اُن کی ہمراہی میں دفتر تک جا بھی سکتے تھے۔ بظاہر یہ سب آداب کے اضافے ہیں اور بے اصل۔

مولانا الطاف حسین حالی نے مرزا کی غیر تمند بی دکھانے کے لیے یہ واقعہ "آبِ حیات" سے اپنی کتاب "یادگارِ غالب" میں نقل کر لی ہے لیکن انھوں نے بھی اس روایت کے خلافِ قیاس اضافوی پہلو کی طرف توجہ نہیں کی۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر بیدوں کے نزدیک کیا ممزا لائق تھے تو وہ شخص مرزا ہے جو فرائضِ منصبی کو بہتر طور سے ادا کرنے کی لیاقت رکھتا ہو۔ خیال یہ تھا کہ نوکر شخص اور وہ شخص جس کے مزاج میں لچک نہ زیادہ مقبول ثابت ہو سکتا تھا۔ ایسے شخص سے توقع کی جا سکتی تھی کہ حکام کے مزاج کے مطابق وہ اپنے معاملات کو ڈھال لیگا۔ اسی لیے فورٹ ولیم کالج کلکتہ میں محمد تقی میر جیسے باکمال استاد پر میر شیر علی افسوس کو جو میر کے مقابلے میں بہت کمتر تھے، ترجیح دی گئی تھی۔ دہلی کالج میں بھی مشیع کمتر اور منکسر مزاج شخص یعنی شیخ امام بخش صہبائی کا انتخاب عمل میں آیا۔ اس انتخاب کا سبب شیفتہ نے یہ لکھا ہے کہ عربی صہبائی کے لیے کم تنخواہ مقرر کی گئی کہ وہ کسی اور جگہ نہ جائیں۔ کیونکہ قابل تھے، حالانکہ ان کے اضافات کی بھی اہمیت تھی یعنی:

۱۔ وہ ایک مدت سے لڑکوں کو تعلیم دیتے آرہے تھے اور دہلی شہر میں ایک کامیاب معلم کی حیثیت سے انھیں شہرت حاصل تھی۔

۲۔ مقابلہ کی طرح تو انھوں نے اُن کے مسائل سے وہ نہ صرف

Marfat.com

بخوبی واقف تھے بلکہ اُن کے مسایل کے حل کی فکر بھی کرتے رہتے تھے اُنھوں نے تدریس کے تقاضوں کے مطابق متعدد کتابیں خود لکھ ڈالی تھیں۔

۳۔ اپنی مختلف تصانیف کے ذریعے سے وہ اس بات کا ثبوت پیش کر چکے تھے کہ علمی مباحث کی تفہیم اور اُن کی پیش کش پر انھیں پوری قدرت حاصل تھی۔

۴۔ مطالعہ، غور و فکر، تصنیف، تالیف اور انشاء پردازی ان کا معمول اور مشغلہ تھا۔ طالب علموں کے سامنے وہ اپنی ذات سے علم و عمل کا لایقِ تقلید نمونہ تھے۔

۵۔ علمی معاملوں میں انہماک اور دوسرے تفریحی مشغلوں سے اُن کا اجتناب بھی استاد کی حیثیت سے ترجیح کا ایک عمدہ سبب تھا۔

جو بھی ہوا ہو، اس میں شبہ نہیں کہ ٹامسن صاحب نے مدرسۂ دہلی میں مدرسی فارسی کی جگہ کے لیے بہترین اور اہل ترین شخص کا انتخاب کر لیا اور اس انتخاب کو اُن کا کارنامہ اور مدرسۂ دہلی کی کوشش بخشی سمجھا جانا چاہیے۔

مولوی نجم الدین کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ سال دو سال کے بعد ہی شیخ امام بخش صہبائی کی تنخواہ میں دس روپے کا اضافہ ہو گیا اور وہ چالیس سے پچاس ہو گئی۔ بعد میں پھر اس میں کبھی اضافہ ہوا یا نہیں اس بارے میں کوئی یقینی حکم نہیں ہو سکی۔

اپنے تقرر کے بعد کسی موقع سے صہبائی نے فتحی آزردہ اور ٹامسن صاحب کی مدح میں قصیدہ پیش کیا۔ قصیدہ در مدح ٹامسن صاحب کی تمہید میں انھوں نے ذاتُ اللہ کے استغنا کی کیفیت

Marfat.com

کا بیان کیا ہے۔ ممکن ہے کہ اِس بیانِ استغنا میں در پردہ اپنی تنخواہ کی کمی کی طرف بھی اشارہ رہا ہو۔

مفتی صدر الدین خاں آزردہ ان کے محسن تھے۔ اُن کی شان میں صہبائی نے اپنے قصیدے میں کہا ہے ؎

دُرجِ دُر آر کشودہ ام پیشِ تو، عیبِ من مکن
کیں دُرِ رخوش آب را، غیرِ تو نیست جوہری

قطع نظر اِس سے کہ یہ قصیدہ صہبائی کی عمدہ صلاحیتوں کا غمّاز ہے اِس سے مفتی آزردہ کے بارے میں رائے قایم کرنے میں بھی مدد ملتی ہے۔

مدرّسین کے تقرر کے بعد، معلوم ہوتا ہے کہ مدرسۂ شاہجہاں آباد کو ترقی دے کر کالج بنا دیا گیا اور اُس کی سربراہی کے لیے فیلیکس بوترو (M - FILIX BOUTROS) کا تقرر عمل میں آیا۔ وہ زمانہ تھا جب علمی کتابیں تقریباً سب عربی اور فارسی میں تھیں۔ اُردو میں ابتدائی نوعیت کی ایسی کتابیں کہ جو تدریسی ضرورتوں کو پورا کرتی ہوں اور نصاب میں شامل کی جا سکتی ہوں۔ کمیاب[ع] تھیں۔ خود صہبائی نے بھی فارسی کی بعض تصانیف کی جو شرحیں لکھی تھیں وہ سب فارسی زبان میں تھیں اور عالم طالب علموں کے لیے وہ بھی عسیر الفہم تھیں۔ پرنسپل بوترو نے حالات پر نظر کر کے اردو میں کتابیں تیار کروانے کا فیصلہ

ع شیخ محمد ابراہیم ذوق نے اپنے ایک قصیدہ میں جو غالباً محرم ۱۲۷۰ھ مطابق ۱۸۵۳ء میں لکھا تھا اُس وقت کے نصاب پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا تھا ؎

ہوا ہے مدرسہ یہ بزمگاہِ عیش و نشاط
کہ شمسِ بازغہ کی جا پڑھیں ہیں بدرِ منیر

Marfat.com

کیا۔ ابتدائی مرحلے میں اُنھوں نے ترجمے کرانے کی فکر کی۔ میر شمس الدین فقیر ایک نہایت ذی علم شخص گذرے ہیں جن کے بارے میں نواب مصطفا خاں شیفتہ نے لکھا ہے:

"فقیر تخلص میر شمس الدین دہلوی، از بنی عباس است، در دری زبان دستگاہ ہے معقول دارد ولاسیما در عروض و قافیہ بینظیر وقتِ خویش است۔ رسالہ جات تصنیف کردہ وے بدیں مدعا گواہ۔ در ۱۱۷۰ھ بعد کسب سعادتِ زیارتِ حرمین شریفین زاد اللہ شرفاً و تعظیماً ہنگام بازگشت زورقِ حیاتش طوفانی شد۔ گاہے ریختہ ہم گفتے این اشعار از وست ؎

خال اس کی بیاضِ گردن کا — نقطۂ انتخاب ہے گویا
ہے غرض دید سے، یاں کام تکلف سے نہیں — خواہ ایدھر بیٹھ گیے، خواہ اُدھر بیٹھ گیے

(گلشن بیخار ص ۱۵۲)

فقیر نے ۱۱۶۸ھ مطابق ۵۵-۱۷۵۴ء میں حدائق البلاغت نامی ایک کتاب لکھی تھی جس میں پانچ ابواب (حدیقے)

بیان - بدیع - عروض - قوافی - معمّا

سے متعلق ایک "خاتمہ" دزدی ہائے شعری" کے بیان میں تھا۔ اپنے موضوع سے متعلق یہ کتاب نہایت اہم اور معتبر خیال کی جاتی تھی اور اُس زمانے میں درس میں بھی شامل تھی۔ پرنسپل بوترو نے صہبائی کی دیانت و لسنت اور لیاقت پر اعتماد کر کے اُن سے اِس کتاب کو اُردو میں منتقل کر دینے کی فرمائش کی۔ یہ فرمائش کرتے وقت بوترو نے صہبائی کی اُردو نثر پر جو اعتماد کیا اُس کے لیے بھی کچھ نہ کچھ بنیاد ضرور ہوئی

Marfat.com

چاہیے۔ ایک صورت یہ بھی ہے کہ اُس وقت تک صہبائی اردو نثر میں کوئی چیز لکھ چکے ہوں اور وہ بوتزو کی نظر سے گذری ہو۔ یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ ترجمہ حدایق البلاغت میں صہبائی نے جو نثر لکھی ہے وہ اُن کے بعض معاصرین کی نثر کے مقابلے میں زیادہ سلیس، رواں اور مدلل ہے۔ بظاہر ایسا شخص جو پہلی بار اردو میں کچھ لکھنے کے لیے قلم اٹھا رہا ہو اتنی صاف اور علمی نثر نہیں لکھ سکتا لیکن چونکہ اب صہبائی کی اردو میں کوئی قدیم تر تحریر دستیاب نہیں ہے اس بارے میں وثوق سے کوئی دعوا بھی نہیں کیا جا سکتا۔

صہبائی کی فارسی تصانیف کی طرح پرنسپل بوتزو کی فرمائش پر لکھی ہوئی اُن کی اردو کتابیں بھی مقبول ہوئیں اور علمی حلقوں میں اُن کی بھی پذیرائی کی گئی۔ دسمبر ۱۸۵۴ء کے اپنے خطبہ میں فرانسیسی مستشرق گارسن دتاسی نے صہبائی کے ترجمے کے بارے میں کہا تھا:

"فارسی کتاب حدایق البلاغت کا اردو ترجمہ ہے۔ ترجمہ کیا یوں کہنا چاہیے کہ انھوں نے اس کتاب کے مطالب کو اردو شاعری پر ڈھال لیا ہے۔" (خطبات ص۹۵)

محض ترجمہ (لفظی یا آزاد) کر دینے کے لیے دونوں متعلق زبانوں سے واقفیت درکار ہوتی ہے لیکن ایک زبان کی کتاب کے تمام مطالب کو دوسری زبان کے ادب پر منطبق کر دینا اور اس عمل میں اس پہلو پر بھی نظر رکھنا کہ پہلی زبان کی کن کن باتوں کا دوسری زبان کی تحریروں پر اطلاق ممکن ہے اور اپنے نقطۂ نظر کی تائید میں ہر محل شہادتوں کے ساتھ استدلال کے لیے بڑی علمیت اور وسعتِ مطالعہ و نظر کی ضرورت ہوتی ہے۔ غور کریں تو صہبائی کا ترجمہ حدایق البلاغت محض ترجمہ

Marfat.com

ہر گز نہیں ہے بلکہ اس کتاب میں اُردو کی عبارت آرائی کے لیے شعوری اور مربوط طریقے پر اصول اور ضابطے متعین کرنے اور اُردو کے شعری اور نثری سرمایے کو علمی اور مدلل انداز سے پرکھنے کی پہلی بار کوشش کی گئی ہے۔ زیادہ اہم بات یہ ہے کہ انہی اصولوں پر صہبائی کہیں بھی اصل موقف سے نہیں ہٹے ہیں۔

شیخ امام بخش صہبائی نے اپنے مقدمے کے مطابق ترجمے کو حمد و نعت پر مشتمل بہت مختصر سی قصیدے سے شروع کیا ہے۔ لفظ کے سہارے تمہید کو طول دیے بغیر مدعا کے بیان کی شروعات بھی صہبائی کا قابلِ ذکر کارنامہ ہے۔ یہاں جب مرزا اسد اللہ خاں غالب نے اُردو میں خطوط لکھنے شروع کیے تو انھوں نے بھی اسی طرز کو اختیار کیا اور وہ اپنے خطوں میں تمہید کی جگہ کو مختصر کرتے ہوئے اپنی خطوط نویسی کے ابتدائیات میں شمار کرتے رہے۔

ترجمہ حدائق البلاغت کے سبب تالیف میں صہبائی نے اپنی بات صراحت کے ساتھ، دو ٹوک انداز سے کہنے کی کوشش کی ہے۔ بیباکی اور بے خوفی کے طرز میں اتنا بے ساختہ پن ہے کہ صہبائی کے اُردو میں اتنا واضح اور قطعی طرز بیان کس طرح اختیار کیا، اس پر حیرت ہوتی ہے۔ لکھتے ہیں:

"مقدور نہیں کہ ہر کہ و صغیر آثار فکر کا
خفا کہ خدا داد ہے نور وحی و الہام کا
حمد کے مضمون کا فکر جب دل میں کرتا ہوں تو
کا بیان جس وقت آتا ہے تو کلماتِ قصیدہ کا عذار
تیکی ظرف دوات بلکہ حسن زنگار سیاہی اور
اس امر سے مانع ہو کر چاہتی ہے کہ اس عقدہ لاینحل

Marfat.com

سے ناخنِ فکر کو نارسائی کا متہم نہ کرے دوستوں واثق
الاخلاص کی خدمت میں دو کلمہ عہ فروگذاری العرض کو عرض کرے
کہ نسخہ حدائق البلاغت علم بیان اور بدیع اور عروض میں
شمس الدین فقیر رحمۃ اللہ علیہ کے قلم بلاغت رقم کا ثمرہ
ہے اور اس کتاب کا اس فن کے استیعاب میں شہرہ ہے۔
صاحب والا مناقب بلند مراتب، حاکم دادگر، دادِ دہش
گستر، بوتراب صاحب بہادر، دام اقبالہ، نے کہ شہر
سعادت سرشار، جہان آباد کے مدارس کے پرنسپل ہیں
فقیر سراپا تقصیر، خاکپائے علما، گدائے کوچۂ فضلا
سرگشتہ تا توانائی امام بخش صہبائی کو، کہ طلبۂ فارسی خواں
کی تعلیم کے لیے مدرسِ اوّل کے عہدے پر مشرف ہے
ارشاد کیا کہ اگر یہ نسخہ فارسی زبان سے اردو میں ترجمہ
کیا جاوے اور اس میں عربی اور فارسی مثالوں کی جگہ
اشعارِ اردو زبان دانانِ ہند کے مندرج ہوں تو ان
لوگوں کے واسطے کہ اردو اشعار سے ذوق رکھتے ہیں
اور اس قدر استعداد نہیں رکھتے کہ عربی اور فارسی
کتابوں سے ان مطالبِ عالیہ کو سمجھ لیں، بہت مفید ہوگا۔
اس واسطے اس خاکسار نے بموجب اس کے کہ المامور
معذور باوجود کمی استعداد کے تقدیمِ امر میں سعی
کر کے اس رسالے کو ۱۲۵۸ھ مطابق ۱۸۴۲ء میں مرتب

عہ مرزا غالب نے بھی اپنے خطوں میں "مدعائے ضروری الاظہار" کی
ترکیب استعمال کی ہے۔

Marfat.com

کیا لیکن مستعدانِ انصاف پسند پر مطالعہ کے وقت ظاہر ہوگا کہ اِس کم استعداد نے مسایلِ علمی کے لکھنے اور امثلۂ اُردو کے فراہم کرنے میں کس قدر سعی کی ہے اور جو کہ یہ مقصود تھا کہ علمِ بیان اور بدیع اور عروض سے طالبین کو فایدہ تام حاصل ہو، اِس واسطے بہت مسایل اصل کتاب سے زیادہ کر دیے تاکہ از بسکہ لفظ بہ لفظ کے ترجمے میں مطلب کی توضیح خوب نہیں ہوتی۔ اس لیے ترجمے میں اِس امر کا مقید نہیں ہوا۔ ہر چند اپنے عندیہ میں غور اور تامل کو کسی مقام میں معاف نہیں رکھا لیکن بہ فحوائے اِس کے کہ اَلْاِنْسَانُ مُرَکَّبٌ مِّنَ الْخَطَاءِ وَالنِّسْیَان اگر خطا ہوی ہو تو کم استعدادی پر نظر کر کے معاف کریں۔ وَاللّٰہُ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْن ٥ جاننا چاہیے کہ اِس کتاب میں پانچ حدیقے اور ایک خاتمہ ہے:

حدیقہ پہلا۔ علمِ بیان میں — حدیقہ دوسرا۔ علمِ بدیع میں
حدیقہ تیسرا۔ علمِ عروض میں — حدیقہ چوتھا۔ قافیے میں
حدیقہ پانچواں۔ فنِ معما میں — اور خاتمہ سرقاتِ شعریہ میں

اور ہر ایک کی تعریف اُس کے موقع میں بیان ہوی۔"

پرنسپل بوترو نے "ان لوگوں کے واسطے کہ اُردو اشعار سے ذوق رکھتے ہیں" صہبائی سے حدایق البلاغت کا ترجمہ کرنیکی فرمائش کی تھی۔ یہ صہبائی کی ذہانت تھی کہ اُنھوں نے اِس نکتہ کو سمجھ لیا کہ "لفظ بلفظ کے ترجمے میں مطلب کی توضیح خوب نہیں ہوتی"، اُنھوں نے اصل کی پابندی کو ضروری نہیں سمجھا۔ صہبائی کا یہ عمل ترجمے کے کام سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے آج بھی مشعلِ راہ ہے۔

صہبائی نے کتاب حدایق البلاغت کو "غور اور تامل" سے

Marfat.com

دیکھا تو معلوم ہوا کہ مطالب کی بحثوں میں میر شمس الدین فقیر سے کئی مقاموں پر سہو ہوا ہے اِس لیے اُنھوں نے اُن مباحث سے متعلق عربی اور فارسی کی مختلف مستند کتابوں کے حوالے سے ایسے مقاموں کی تصحیح کو بھی خود پر لازم کر لیا۔ یہ ترجمہ چونکہ وہ اُردو شاعری کے نقطۂ نظر سے کر رہے تھے، اُن اُمور کی نشاندہی کو بھی اُنھوں نے ضروری سمجھا جن کا اِس زبان سے تعلق نہیں ہے اِس طرح اُن کا یہ ترجمہ اصل کتاب سے بہت حد تک مختلف ہو گیا بلکہ اِس میں "بہت مسایل اصل کتاب سے زیادہ" بھی ہو گئے یہ محض اُن کی علمی دیانت تھی کہ اِن سب کے باوجود صہبائی نے اِسے اپنے تالیف قرار دینے کے بجائے ترجمہ ہی کہا ہے البتہ اِس کام پر اُنھوں نے جو محنت کی تھی اُس کے لیے وہ داد طلب ضرور تھے۔ خاتمۂ کتاب میں لکھتے ہیں:

"ترجمہ حدایق البلاغت کا تمام ہوا۔ اوپر شایقین کے بر وقت مطالعہ کرنے کے یہ بات معلوم ہو جائیگی کہ مترجم فقط کتاب کے اصل مطالب پر قانع نہیں ہوا بلکہ جس مقام میں سوا اِس کے اور مطالب مناسب پائے ہیں اِس میں زیادہ کر دیے ہیں اور چند جاے ایسا بھی ہوا ہے کہ جو ترتیب مصنف کی اپنی راے ناقص میں پسند نہیں اسی اُس کو تغیر دے کر اور ترتیب سے لکھا ہے از بسکہ انسان ضعیف البنیان کی سرشت سراپا سہو اور خطا ہے، اگر وہ مترجم کے زعم کے موافق نہ ہو کیش مروت میں چشم پوشی کرنا بہتر اِس سے ہے کہ کسی کے اظہار عیب میں سعی کریں صدق اللہ عزّ وجلّ

Marfat.com

اذا مرّوا باللّغو مرّوا کراماً تمام شد ترجمہ حدائق البلاغت"

اُوپر جو اقتباس نقل ہوئے ہیں اُن سے معلوم ہوتا ہے کہ اپنے ترجمہ کا صہبائی نے کوئی مخصوص نام نہیں رکھا تھا اس کتاب کے اب تک کئی ایڈیشن مختلف مطبعوں سے اشاعت پذیر ہو چکے ہیں اور اُن سے بھی اس ترجمے کے کسی جداگانہ نام کا پتا نہیں چلتا البتہ قاضی محمد سعید نے کتبخانۂ خدا بخش پٹنہ کی اُس فہرستِ مخطوطات کے سلسلے میں جو قاضی عبدالودود صاحب نے مرتب کی تھی، ذیل کے الفاظ لکھے ہیں:

"(۱۲۳) ہدایت البلاغت، غالباً صہبائی کا ترجمہ"

(فہرست نمائش ص۱۱۷)

اِس بارے میں مزید تلاش و جستجو کی ضرورت ہے۔

مصنف حدائق البلاغت سے صہبائی نے اپنے ترجمے میں جس طور پر اختلاف کیا ہے اس کی مثال یہ اقتباس ہے

"جن لوگوں نے یہ توہم کیا ہے کہ وہ مختص نثر کے ساتھ ہے یہ محض بیجا ہے کس واسطے کہ وہ نثر اور نظم دونوں میں جاری ہوتی ہے جیسے نثر اور نظم کی مثال سے واضح ہو گیا ہے اور توہم نثر سے خصوصیت رکھنے کا اس سبب سے ہے کہ عربی کتابوں میں اس صنعت کی تعریف میں لکھا ہے کہ وہ مساوی ہونا دونوں فاصلوں کا ہے وزن میں اور فاصلہ نثر کے الفاظِ اخیرہ ہی کو کہتے ہیں اور یہ نہ جانا کہ ذکر فاصلہ کا بطریق احتراز کے نہیں ہے تاکہ اس سے نظم خارج ہو جاوے بلکہ بطریق مثال کے ایک کا ذکر کر دیا ہے اور بنا پر اختصار کے مصرع کا ذکر چھوڑ دیا ہے اور

Marfat.com

چونکہ یہ صنعت نظم میں بھی جاری ہوتی ہے شرح کرنے والوں
نے فاصلہ کے آگے لفظ مصرع کا بھی لاحق کر دیا ہے یہاں
سے معلوم ہوا کہ حدائق البلاغت کے مصنف نے جو یہ کہا
ہے کہ یہ صنعت نظم میں نہیں آتی کیونکہ نظم کے آخر میں
قافیہ واجب ہے از روئے سہو کے ہے"

اِس مثال سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ صہبائیؔ اختلاف برائے اختلاف کے عادی نہیں تھے جس جگہ ایسا کرنا ضروری ہوتا تھا، وہ دلایل پیش کرتے تھے۔ وہ محض اتنی بات پر قناعت نہیں کرتے تھے کہ غلطی کو ظاہر کر دیں بلکہ غلطی کے سبب کو بھی معلوم کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ اِس طریقۂ کار سے اُن کی بات کا وزن زیادہ ہو جاتا تھا۔

بلاغت، بدیع اور عروض کے بعض مسئلے اور گوشے ایسے بھی تھے جو فارسی سے متعلق ہیں لیکن اُردو نثر و نظم میں جاری نہیں ہیں۔ صہبائیؔ نے اپنے ترجمے میں اُن کی بھی نشاندہی کی ہے مثلاً:

"تین حروف باقی اشعارِ فارسی میں اکثر الوقوع ہیں۔ اِس کی مثالیں بھی فارسی میں تلاش کرنی چاہئیں اور چونکہ اشعارِ اُردو میں نہیں آتے، اِن کی مثال اُردو کے اشعار میں نہیں ہے، اِس واسطے اِن کا بیان ترک کر کے شعبہ دوسرے کو لکھتا ہوں"۔

(ایضاً ص ۱۴۹)

اور:

"قافیہ متکاوس اشعارِ فارسی میں بھی نہیں آتا، چہ جائے اشعارِ اُردو کے اِس واسطے اِس کی مثال مرقوم

Marfat.com

نہیں ہوئی۔" (ایضاً ص۱۵۵)

" ازبسکہ حروفِ خروج کا اشعارِ اُردو کے قافیہ میں خود
ہی نہیں واقع ہوتا ہے اِسی واسطے یہ حرکت بھی نہیں
واقع ہوسکتی۔ پس اشعارِ اُردو کے قافیہ میں پانچ
حرکتیں آسکتی ہیں جیسے معلوم ہوچکا۔"

(ایضاً ص۱۵۰)

اِن مقاموں کو الگ کرکے اگر اِن کا تفصیلاً جایزہ لیا جائے تو اُردو اور فارسی زبانوں کے مزاج اور اُن کی شناخت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

اپنے ترجمے میں صہبائیؒ نے حسب موقع بعض مطالب کا اضافہ بھی کیا ہے۔ اِس کی ایک مثال یہ ہے:

" حدایق البلاغت کے مصنف نے اگرچہ بحرِ قریب اور
جدید اور مشاکل کو مذکور نہیں کیا لیکن مترجم کو مناسب
معلوم ہوتا ہے کہ طالبین کے فایدہ کے واسطے اُن کو
بھی لکھیے۔"

اِسی طرح شمس الدین فقیر نے اپنی کتاب میں شعر کی تعریف صرف تین سطروں میں بیان کی تھی۔ صہبائیؒ نے اپنے ترجمے میں اِس موضوع سے متعلق تین صفحے صَرف کیے ہیں اور اِس طرح اُنھوں نے اِس بات کی کوشش کی ہے کہ اُن کی کتاب زیادہ سے زیادہ مفید اور سریع الفہم ہوجائے خود کہتے ہیں:

" حتی الوسع ہر مطلب میں تفصیل بخوبی کی گئی ہے تاکہ
مبتدیوں کو اِس فن کا سمجھنا آسان ہوجاوے۔
واللہ اعلم بالصواب"

Marfat.com

پرنسپل بوتر نے شیخ امام بخش صہبائیؒ سے بس اتنا کہا تھا کہ "عربی فارسی مثالوں کی جگہ اشعارِ اُردو مندرج ہوں" لیکن صہبائیؒ نے کہ جو ایک ہوشمند اور تجربہ کار استاد تھے اور مسایل کی سوجھ بوجھ رکھتے تھے، اِس نکتہ کو سمجھ لیا کہ محض مثالوں کے دینے سے بات نہیں بنتی۔ اُنھوں نے اپنے ترجمے میں اکثر مثالوں سے بحث کر کے متعلق نکات کی۔ توضیح و تصریح بھی کی ہے اور اِس طرح کتاب کو مبتدیوں کے واسطے مفید تر بنا دیا ہے مثال کے طور پر حکیم محمد مومن خاں مومنؔ کے ایک شعر سے اِس طرح بحث کی ہے:

"اُس نقشِ پا کے سجدہ نے کیا کیا کیا ذلیل
میں کوچۂ رقیب میں بھی سر کے بل گیا

معشوق کے نقشِ پا کو سجدہ کرنا اُس کی تعظیم ہے اور ظاہر اور متعارف یہ ہے کہ کسی معتقد فیہ سے ذلیل نہ ہو۔ پس تعظیم سے ذلیل ہونا ایک وصف ہے کہ فی نفسہٖ ثابت نہیں لیکن محال بھی نہیں بلکہ ممکن ہے کہ وہ امر کسی کے حق میں موجب ذلت کا ہو جاوے اور از بسکہ یہ امر غیر ثابت تھا اِسی واسطے مصرعِ ثانی میں اُس کی علت بیان کی یعنی معشوق کو چۂ رقیب میں تھا اور جب عاشق نے اُس جگہ نقشِ پائے معشوق کو سجدہ کیا تو رقیب کے کوچہ میں سر کے بل جانا واقع ہوا اور ایسے مقام میں اِس طرح کے امر کا ظہور میں آنا موجب ننگ کا ہے"

اِسی طور پر سرقے کے بیان میں بھی صہبائیؒ نے دو شعروں کا مقابلہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

"(سرقے کی) قسم پانچویں یہ ہے کہ کسی اور کے مضمون سے

Marfat.com

کچھ لے کر اور چیزیں ایسی بڑھا دیں کہ بہ نسبت اول کے
زیادہ لطف ہو جاوے جیسے اِن دو شعروں میں شعرِ اول
مومن کا ؎

خوں بہا قاتلِ بے رحم کا مانگا کس نے
کہ فرشتے مجھے یاں داغِ دِرم دیتے ہیں

دوسرا شعر شیخ ابراہیم ذوق کا۔ شعر

کہتی تھی ہاہی بریاں کہ دبیرانِ قضا داغ دیتے ہیں اُسے جس کو دِرم دیتے ہیں

ظاہر ہے کہ اول شعر میں داغِ دِرم دینا اور خوں بہا مانگنا
محض ادّعا ہے اور دوسرے شعر میں داغ دینا اور صاحبِ
دِرم ہونا ثابت ہے۔ اول شعر سے داغ اور دِرم کا مضمون اخذ کر کے
ایسی طرح پر ادا کیا کہ اس کی نسبت بلیغ ہو گیا ہے،،

شعر کی خوبیوں اور خامیوں کو سمجھانے کے لیے اِس قسم کی بحثیں شامل کر کے صہبائی نے طالب علموں کے نقطۂ نظر سے بہت مفید کام کیا ہے۔ اِن بحثوں کو دیکھ کر خیال ہوتا ہے کہ اُردو شاعری اور اس کے معاملات و مسایل سے صہبائی کو کس حد تک شغف تھا اور اِس زبان کے نثری اور شعری سرمایے پر اُن کی کتنی گہری نظر تھی۔ یہ بات یک لخت پیدا نہیں ہو سکتی۔

شیخ امام بخش صہبائی کی جو تصانیف معلوم ہیں اُن میں سب

؎ اِن شعروں میں یہ پہلو بھی غور طلب ہے کہ پہلے شعر میں فرشتوں کا عمل ثابت نہیں ہے جب کہ دوسرے شعر میں "دبیرانِ قضا" کی کارفرمائی ظاہر و معلوم ہے بلکہ لفظ "قضا" میں ایہام کا لطف بھی موجود ہے۔

Marfat.com

سے زیادہ شرحیں ہیں۔ اُن کے بعد فنِ معمّا سے متعلق اُن کی کتابوں کی تعداد ہے۔ اِس فن سے اُن کو شروع سے دلچسپی رہی ہے اور یہ دلچسپی آخر عمر تک قایم رہی ہے۔ اِس کے لیے اُنھوں نے اتنی شہرت پای کہ اکثر اُنھیں "صہبائیِ معمّائی" بھی کہا گیا ہے اُن کی کتاب قولِ فیصل پر اُن کا نام اِس طرح چھپا ہے:

"محققِ زماں مولانا امام بخش مغفور معمائی متخلص بہ صہبائی"

اور کلیاتِ صہبائی میں اُن کا نام اِس طور سے تحریر ہے:

"فہرستِ رسایلِ کلیاتِ مولانا امام بخش معمّائی متخلص بہ صہبائی"

فنِ معما نہایت مشکل اور دماغ سوزی کا باعث ہوتا ہے۔ عام لوگوں سے قطع نظر بیشتر اہلِ علم بھی اس سے گھبراتے تھے۔ صہبائی کے ہمعصر مرزا اسد اللہ خاں کو بھی اس فن سے علاقہ نہیں تھا چنانچہ صفیر بلگرامی کے ایک بار یہ لکھنے پر کہ:

"پٹنہ کے لوگ آپ کے معمّا اور چیستان کے مشتاق ہیں"

مرزا نے اُنھیں لکھا:

"یارب وہ کون بزرگ ہیں کہ سودائی کو معمّائی سمجھتے ہیں اصل فطرت میں میرا ذہن تاریخ و معمّا کے ملایم نہیں پڑا ہے۔ جوانی میں از راہِ شوخیِ طبع گنتی کے تین عامیانہ معمے لکھے۔ وہ مبادی کلیاتِ فارسی میں موجود ہیں"

(غالب اور صفیر)

جب صہبائی کے اِس سب سے زیادہ نام برآوردہ معاصر کا یہ عالم ہو تو صاحبانِ انگریز کو اِس فن سے جس حد تک دلچسپی ہو سکتی تھی ظاہر ہے۔ پرنسپل بوتر وے نے صہبائی کو حدایق البلاغت کے اُس جزو کا جو "معمّا"

Marfat.com

سے متعلق تھا ترجمہ کرنے سے منع کر دیا۔ اِس سے اُن کو جتنا ملال ہوا ہوگا ظاہر ہے لیکن اُنھیں کے لفظوں میں اَلمامُورُ معذورٌ وہ ملازمت کرتے تھے۔ تعمیلِ حکم کے سوا چارہ نہیں تھا اِس ترجمے میں بڑے افسوس کے ساتھ لکھتے ہیں:

"حدیقہ یا نخواں معمے کے فن میں معلوم کیا چاہیے کہ یہ فن ایک شعبہ ہے بدیع کا اور معمّا ایک صنعت ہے صنایع لفظی سے لیکن اِس فن کے قواعد اور فروع اِس کے متکثرہ ہیں گویا برائے ایک فن علاحدہ معلوم ہوتا ہے اور یہ فن طبایع فہیم کے نزدیک اَلطف فنون کا اَلذّ اشیا کا ہے۔ لیکن چونکہ بیشتر اشخاص کو بہ سبب دقّت کے اِس طرف رغبت کم ہے اِس واسطے صاحب والا مناقب پرنسپل بوترو سن صاحب پرنسپل بہادر دام اقبالہٗ کا اِرشاد اِس طرح پر ہوا کہ اس فن کو ترک کرنا چاہیے، اِس سبب سے مترجم بموجب اِس عبارت کے کہ اَلمامُورُ معذورٌ اِس حدیقہ کے ترجمے سے ہاتھ اُٹھا کر خاتمہ کا ترجمہ کرتا ہے۔"

(ترجمہ حدایق البلاغت ص۱۵۷)

مدرسۂ شاہجہاں آباد کے نصاب سے فنِ معمّا کو خارج کر دیا گیا۔ یاد رکھنے کی بات ہے کہ جب کسی قوم پر زوال آتا ہے تو اُس کے اہلِ علم ذہنی مشقت سے بچنے لگتے ہیں۔ فنِ معما کو جو بقولِ صہبائی لطفِ فنون ہے ہندوستان کے صاحبانِ علم نے زندہ رکھنے کی کوئی تحریک نہیں کی اور ایک پرنسپل بوترو کے حکم کے نتیجے میں بہت جلد یہ فن مردہ ہو گیا۔ آج اس کا حال صرف فارسی کی کتابوں میں باقی رہ گیا ہے۔ فَاعْتَبِرُوا یَا اُولِی الْاَبْصَارِ

Marfat.com

ترجمہ حدایق البلاغت اپنے موضوع سے متعلق اُردو میں اپنی نوعیت کی پہلی کتاب ہے۔ اِس اعتبار سے اِسے تاریخی اہمیت بھی حاصل ہے۔ یہ کتاب پرنسپل بوترو کی فرمائش سے وجود میں آئی تھی۔ اغلب ہے کہ اُنھوں نے ہی اِس کے چھپوانے کا بھی انتظام کیا ہوگا۔ اِس کا پہلا ایڈیشن ۱۸۴۳ء میں نکلا تھا۔ تکمیل کے بعد طباعت کے مراحل سے گزرنے میں دوسرے سال کا شروع ہو جانا کچھ بعید نہیں۔ یہ کتاب اتنی مقبول ہوئی کہ ہاتھوں ہاتھ نکل گئی۔ دوسرے ہی سال میں اِس کا دوسرا ایڈیشن چھپا۔ ہمارے لیے یہ متعین کرنا ممکن نہیں ہو سکا ہے کہ دوسرے ایڈیشن میں صہبائی نے کوئی ترمیم کی تھی یا نہیں۔ مولوی کریم الدین نے دونوں ایڈیشنوں کا ذکر کرتے ہوئے اتنا لکھا ہے:

"بموجب حکم سکریٹری سوسائٹی کے کتاب حدایق البلاغت کا ترجمہ جو اصل میں شمس الدین فقیر کی تصنیف ہے، زبان اُردو میں اِس شخص (صہبائی) نے بہت اچھا کیا ہے۔ یہ ترجمہ دریاں سنہ ۱۸۴۶ء کے سید عبد الغفور کے اہتمام سے سید الاخبار دہلی درمیان کوچہ چیلوں کے چھپا۔ بعد ازاں سنہ ۱۸۴۷ء میں میرے اہتمام سے بھی رفاہِ عام واقع حوض قاضی میں چھپا۔" (لمعات الشعرا)

پرنسپل بوترو نے غالباً صہبائی کے مشورے سے دہلی کالج میں ایک انجمن اشاعتِ علوم بنائی تھی۔ اِس کا ذکر کرتے ہوئے مولوی عبد الحق مرحوم نے لکھا ہے:

"مسٹر بوترو کا تقرر کالج کی پرنسپلی پر ۱۸۴۲ء میں ہوا

Marfat.com

اور اُس وقت سے انگریزی زبان کی کتابوں کا ترجمہ تھوڑا تھوڑا کر کے اُردو میں ہونا شروع ہوا۔ ۱۸۴۳ء میں انجمن اشاعتِ علوم بذریعہ السنۂ ملکی قایم ہوئی اور سرمایے کے بہم پہنچنے سے یہ کام کالج میں باقاعدہ ہونا شروع ہو گیا اور کتابیں دہلی ورنیکلر ٹرانسلیشن سوسائٹی کی نگرانی میں طبع ہونے لگیں۔" (مرحوم دہلی کالج ص ۱۳۳)

یہ کہنا مشکل ہے کہ صہبائی انگریزی زبان سے واقف تھے یا نہیں لیکن اِس بارے میں شبہ نہیں کہ اِس زبان کو سیکھ لینے کے اُن کے پاس مواقع تھے۔ کالج کے انگریز پرنسپل اور دوسرے عملے سے اُنھوں نے انگریزی زبان کے بعض الفاظ اور مطالب ضرور حاصل کر لیے ہوں گے۔ پرنسپل بوتر و کی ٹرانسلیشن سوسائٹی میں انگریزی کتابوں کے ترجمے کی حد تک تو بظاہر صہبائی نے کوئی اہم کردار ادا نہیں کیا ہوگا لیکن اِس سوسائٹی کی کارکردگی میں اُن کو دخل ضرور رہا ہوگا۔ یہ اُس ماحول کا ہی اثر تھا کہ انگریزی کے الفاظ پرنسپل، سکریٹری وغیرہ بے تکلف اُن کی زبان اور اُن کے قلم سے نکل جاتے تھے۔ شعر اور ترجمہ وغیرہ سے متعلق اُن کے نقطۂ نظر میں جو وسعت اور جدت پائی جاتی ہے اُسے بھی اِس سوسائٹی کے فیوض میں خیال کیا جا سکتا ہے۔

پرنسپل بوتر و شیخ امام بخش صہبائی کی صلاحیتوں اور لیاقت کے معترف تھے چنانچہ یہ بات بخوبی ممکن ہے کہ جو کتابیں اُردو ترجمہ ہو کر آتی ہوں، سوسائٹی کے ایک اہم رکن کی حیثیت سے صہبائی دیکھ لیتے ہوں اور نظرِ ثانی میں زبان و بیان کی [illegible] میں بھی معاون ہوتے ہوں۔ افسوس ہے کہ اِس سلسلے کی اُن کی خدمات کے بارے میں اب کوئی بات معلوم نہیں ہوتی۔ رامبابو سکسینہ نے

Marfat.com

مذکورہ سوسائٹی کے بارے میں بس اتنا لکھا ہے کہ:

"۱۸۴۲ء مطابق ۱۲۵۸ھ میں دہلی کالج کی سرپرستی میں ایک انجمن کھولی گئی جس کے روحِ رواں پروفیسر رامچندر اور مولانا صہبائی تھے۔ اِس انجمن کی قابلِ ستائش کوششوں سے اکثر مفید کتابیں تیار ہوئیں جو دلّی میں چھپیں اور طلبا کے بہت کام آئیں"۔

(تاریخ ادب اردو حصہ نثر ص۷۸)

سوسائٹی کے کاموں کا آغاز تو بظاہر پرنسپل بوترو کے تقرر کے بعد ہی شروع ہو گیا تھا البتہ اِس سوسائٹی کی باضابطہ تشکیل اگلے سال عمل میں آئی اور اُسی وقت صہبائی نے حدائق البلاغت کے ترجمے کے کام کو مکمل کیا تھا اِس کے بعد ہی طباعت کے انتظامات کرنے کی ضرورت پیش آئی اور اِس سلسلے کا آغاز بھی بظاہر صہبائی کے ترجمہ حدائق البلاغت سے ہوا۔ ترجمہ کرانے کے لیے سوسائٹی نے جو طریقہ کار اختیار کیا تھا اُس کا ذکر بقول مولوی عبدالحق خود پرنسپل برترو نے اِس طرح کیا تھا:

"پرنسپل کی تحریک پر یا اُس کے مشورے سے ہندوستانی مدرّس مطبوعہ یا قلمی کتاب کو اُردو ترجمے کے لیے انتخاب کرتے تھے اُنھیں یہ پہلے ہی بتا دیا گیا تھا کہ اگر اُن کے ترجمے اچھے ہوئے تو جہاں تک جلد ممکن ہو گا اُن کے یہ ترجمے طبع کروا دیے جائیں گے اور انھیں فی صفحہ چھ آنے سے بارہ آنے تک کی شرح سے معاوضہ دیا جائے گا۔ طبع سے پہلے ترجمے کی نظرِ ثانی مترجم کے مواجہ میں صدر مدرس یا پرنسپل کرتے تھے..... مدرسین پڑھاتے وقت

Marfat.com

تمام غلطیوں اور مبہم جملوں وغیرہ پر جو اُن کی رائے میں قابلِ اصلاح ہیں نظر رکھیں اور قلمبند کر لیں۔ توقع کی جاتی ہے کہ ہر ترجمہ گو شروع میں کیسا ہی ناقص ہو آخر میں تمام غلطیوں سے پاک صاف ہو جاتا ہے۔"

(مرحوم دہلی کالج ص۱۳۳ تا ص۱۳۴)

تصنیف، تالیف اور ترجمے کے کاموں کی اِس سوسائٹی کی طرف سے نہ صرف زبانی پذیرائی ہوتی تھی بلکہ معقول معاوضہ بھی دیا جاتا تھا۔ یہ صورت حال صہبائی جیسے فنافی العلم لیکن مالی اعتبار سے تنگدست شخص کے لیے بہت حوصلہ افزا ثابت ہوئی۔ اُنھوں نے زیادہ دلجمعی اور زیادہ تیزی کے ساتھ اپنے علمی کاموں کو آگے بڑھایا۔

دہلی میں اُس زمانے تک اردو کے شاعروں کا کوئی تذکرہ اُردو زبان میں نہیں لکھا گیا تھا۔ تدریسی ضرورت سے صہبائی نے اُردو کے مشہور شاعروں کے کلام کا ایک انتخاب تیار کیا اور اُس میں ہر شاعر کے صرف ضروری حالات لکھ دیے۔ اپنی طبعی انکساری سے کام لے کر اُنھوں نے اِس مجموعہ کا نام "انتخابِ دواوین" مقرر کیا لیکن یہ بات خود صہبائی کے لیے بھی طمانیت کا سبب بنی ہو گی کہ اُن کے اِس انتخاب کو عام طور سے تذکروں کی ذیل میں رکھا گیا۔ گارساں دتاسی نے دسمبر ۱۸۵۴ء کے اپنے خطبے میں اِس کا تعارف کراتے ہوئے کہا تھا:

"انتخابِ دواوین شعرائے مشہورِ زبانِ اردو
کا۔ اِس کے مؤلف امام بخش صہبائی پروفیسر دہلی کالج
ہیں۔ یہ فارسی کے بہت بڑے استاد مانے جاتے ہیں۔
اِسے ہم محض انتخاب نہیں کہہ سکتے اِس لیے کہ انتخابات کے
ساتھ شاعروں کے مختصر حالات بھی درج ہیں یہ بھی ایک

Marfat.com

قسم کا تذکرہ ہے۔ یہ حالات اُردو زبان میں ہیں۔ اِس تالیف میں ولی، درد، سودا، میر، جرات، نصیر ممنون، ناسخ، مولچند، ذوق اور مومن کے کلام کے انتخابات ہیں، یہ کتاب ۱۲۶۰ھ میں لکھی گئی اور ۱۸۴۲ء میں طبع ہوئی۔ کل ۲۷۳ صفحے ہیں اور ہر صفحے میں بیس سطریں ہیں۔ شروع میں ۲۳ صفحے کا ایک مقدمہ ہے جس میں صہبائی نے ہندوستانی شاعری اور اِس زبان کی خاص خاص نظموں کی بحروں پر بحث کی ہے اور ساتھ بہت اچھی مثالیں بھی دی ہیں۔ ایک کتاب جو دہلی میں خلاصۂ دیوانہا کے نام سے طبع ہوئی ہے وہ بھی یہی معلوم ہوتی ہے۔" (خطبات ص۹۲)

بعد کے زمانے میں مولوی محمد ذکاء اللہ نے اپنے رسالۂ تذکرات میں بھی جو دراصل گارساں دتاسی ہی کی تحریر کا ترجمہ ہے، یہی بات اِن لفظوں میں قلمبند کی:۔

"انتخابِ دواوین۔ مولوی امام بخش صہبائی کی تصنیف سے ہے۔ مولوی صاحب دلّی کے مدرسے کے مدرّس ہیں اور زبانِ فارسی میں کامل ہونے کے سبب بہت نام آور اور جہاں میں مشہور ہیں۔ اگرچہ انتخابِ دواوین ہے یعنی شاعروں کے دیوان میں سے اشعار چھانٹ چھانٹ کر لکھ دیے ہیں لیکن اِس میں کچھ کچھ شاعروں کا بھی حال ہے اِس سبب سے اِس پر تعریف تذکرہ کی صادق آتی ہے۔ اِس میں ولی، درد، سودا، میر و جرات و حسن و نصیر و ممنون و ناسخ و مولچند و

Marfat.com

ذوقؔ و مومنؔ کے دواوین میں سے اشعار منتخب کرا کر
لکھے ہیں اور ایک دیباچہ ابتدا میں تینتیس صفحہ کا اِس
کے اول لکھا ہے اور اِس میں عروض و قوافی کا بیان
ہے اور اِس میں مثالیں اچھی اچھی لکھی ہیں، سنہ ۱۲۶۰ھ و
سنہ ۱۸۴۲ء میں منطبع ہوا تھا۔ صفحہ اِس کے دو سو تہتر ۲۷۳
ہیں اور ہر صفحہ میں اِس کے تیئیس سطریں ہیں اور
دہلی میں جو خلاصۂ دواوین چھپا ہے وہ یہی انتخاب
دواوین ہے۔ صہبائی کا سن قریب ساٹھ سال
کے ہوگا۔ اِس کتاب میں اُنھوں نے بہت کم شعر
لکھے ہیں۔ اور اور کتابیں اُن کی تصنیف سے ہیں۔ حدیقۃ
البلاغت کا فارسی سے اُردو میں ترجمہ کیا ہے اور ایک
رسالہ زبان کی صرف و نحو میں مرتب کیا ہے اور ایک
رسالہ معمے میں بھی لکھا ہے اور بہت کتابیں اُن کی
تصنیف سے ہیں۔" (رسالہ تذکرات، صفحہ ۳۷)

صہبائی کے اِس انتخاب دواوین کو "خلاصۂ دیوانہا" گارساں
دتاسی کے سوا کسی نے نہیں کہا ہے مولوی ذکاء اللہ نے اِسی کو
"خلاصۂ دواوین" کا نام دے دیا ہے۔

اوپر کے دونوں اقتباسوں میں سالِ طبع سنہ ۱۸۴۳ء لکھا ہے جو صحیح
نہیں ہے سنہ ۱۲۶۰ھ مطابق ہوتے ہیں سنہ ۱۸۴۴ء سے اور یہی انتخاب دواوین
کا صحیح سالِ طباعت ہے۔ رسالہ تذکرات میں صہبائی کی عمر جو دس
منقول ہے بگارساں نے لکھا ہے حالانکہ اُس کے مذکورہ خطبہ کے
دیباچہ سے بعد مولوی ذکاء اللہ نے رسالہ تذکرات کا کام شروع
کیا تھا۔ یہ ذکر آچکا ہے کہ صہبائی کی عمر کے بارے میں خود گارساں دتاسی

Marfat.com

کو بھی غلط فہمی تھی۔ اُن کے سالِ ولادت سے متعلق شروع میں جو کہا گیا ہے اُس کے مطابق "دا انتخاب دواوین" کی تالیف یعنی ۱۲۶۰ھ مطابق ۱۸۴۴ء میں صہبائیؔ کی عمر چالیس کے قریب رہی ہوگی۔

صہبائیؔ کے انتخابِ دواوین کے بارے میں مولوی کریم الدین نے لکھا ہے:

"مولوی امام بخش صہبائیؔ نے ایک انتخابِ دواوین واسطے سوسائٹی کے چھپوا دیا ہے۔"

اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کام بھی صہبائیؔ نے پرنسپل بوتروکی فرمائش سے سوسائٹی ہی کے واسطے کیا تھا۔ کریم الدین نے اِس کتاب کے بارے میں یہ بھی لکھا ہے کہ:[1]

"ایک اُردو زبان کے شعرا کا مجموعہ اُنھوں (صہبائیؔ) نے طیار کر کے اُس میں غزلیات اور گیت گانے بجانے کے مع تعریف قصیدہ اور بیان بحور و عروض کے یعنی رباعی و قطعہ و مسدس وغیرہ کے چھپوا دیا۔ یہ انتخاب[2] ۱۸۴۴ء میں چھپ کر طیار ہوا۔" (طبقات شعرا)

---

[1] راقم کے نزدیک "شعرا کا مجموعہ" سے بہتر یہ ہے کہ شعرا کے کلام کا مجموعہ کہا جائے۔ اِسی طرح ہمارے زمانے میں انتخابِ ناسخ اور انتخابِ غالب وغیرہ ترکیبوں کا چلن ہو گیا ہے۔ یہ بھی محلِ نظر ہے انتخاب کلام ناسخ یا انتخاب غزلیات غالب کہنا چاہیے۔ ناسخ یا غالب ایک شخص ہے اور شخص کا انتخاب کیا ہوگا؟

[2] صہبائیؔ کا انتخاب دواوین ایک سے زاید بار طبع ہوا تھا چنانچہ مطبع العلوم دہلی سے بھی ۱۸۴۷ء میں ٹکڑہ سو کی تعداد میں چھپا تھا اور اُس کی قیمت دو روپے تھی۔

Marfat.com

اِس انتخاب میں صہبائی نے شاعروں کی ترتیب زمانے کے لحاظ سے قایم کی تھی اور اِس میں اُن کی عمر اور سالِ وفات دونوں پر نظر رکھی تھی۔ جرأت اگرچہ میر کے مقابلے میں ایک سال پہلے مرے تھے، عمر میں اُن سے چھوٹے تھے اِس لیے صہبائی نے اُن کو مؤخر رکھا ہے۔ صہبائی کے بعد سے اب تک اُردو شاعری کے تمام تاریخ نویس اِس معاملے میں اُن کی اتباع کرتے آرہے ہیں۔

معاصرین کے بارے میں فیصلہ کرنا آسان نہیں ہوتا۔ صہبائی کو بھی اِس باب میں دشواری ہوئی۔ اُنھوں نے ناسخ کا ذکر ممنون کے بعد کیا ہے جو صحیح نہیں تھا لیکن نصیر اور ممنون کا ساتھ رہا تھا اِس لیے صہبائی نے اِن دونوں کا ایک ساتھ ذکر کرنا مناسب سمجھا اور ناسخ کو اُن کے بیچ میں نہیں لائے۔ ممنون کے بارے میں صہبائی نے لکھا ہے:

"آجکل بہ باعث ضعفِ اعضا اور بنیائی کے خانہ نشین یعنی شاہجہاں آباد میں وارد ہے"

ممنون نے مئی ۱۸۴۳ء میں بیمار ہوکر ۱۸۴۴ء مطابق ۱۲۶۰ھ میں وفات پائی تھی اِس لیے آفتابِ سپہرِ بالا کی روشنی میں یقین کے ساتھ بس اتنا کہا جا سکتا ہے کہ ۱۸۴۳ء کے وسط میں صہبائی انتخابِ دواوین کی تیاری میں مصروف تھے۔ شاید ترجمہ حدایق البلاغت سے فرصت پانے کے بعد وہ اِس کام میں لگ گئے تھے۔

شیخ امام بخش صہبائی کے انتخابِ دواوین سے کوئی پینتالیس برس پہلے علی ابراہیم خاں خلیل کے تذکرہ گلزارِ ابراہیم کے اُردو میں دو ترجمے ہوئے تھے۔ وہ فورٹ ولیم کالج کلکتہ کی اُردو نثر کا نمونہ دکھاتے ہیں۔ صہبائی کے معاصر حکیم میر قطب الدین باطن نے آگرہ میں ۱۲۵۹ھ مطابق ۱۸۴۳ء میں شیفتہ کے تذکرہ گلشنِ بیخار کے جواب میں اُردو میں

Marfat.com

ایک تذکرہ گلستانِ بیخزاں لکھا۔ اِس کے بارے میں پروفیسر گیان چند نے معلوم نہیں کس طرح یہ لکھ دیا کہ :

"مرزا قطب الدین باطن نے تذکرہ گلستانِ بیخزاں عرف نغمۂ عندلیب لکھا یہ مشہور ہے کہ یہ تذکرہ مولانا امام بخش صہبائی کی تصنیف ہے۔"

(اردو مثنوی ص۲۰۷)

ہمارے علم میں ایسی کوئی روایت نہیں ہے کہ جس میں گلستانِ بیخزاں کو صہبائی کا تصنیف کردہ کہا گیا ہو۔ تذکرۂ باطن کی زبان اور اُس کا طرزِ بیان صہبائی کے انتخابِ دواوین کے مقابلے میں بہت زیادہ پیچیدہ مصنوعی اور رنگین ہے، مثلاً اِس تذکرے سے ذوق کا حال ذیل میں نقل کیا جاتا ہے :

"ذوق تخلص شیخ محمد ابراہیم نام، دہلی وطنِ قدیم، شاعرِ مسلم الثبوت جن کا خطاب خاقانیِ ہند، خاقانی کے ندیم خامۂ جادو نگار رشکِ سحرِ سامری، مصرعِ برجستہ رشکِ خنجرِ ابروے پری، بیاضِ رشکِ گردنِ محبوباں، سوادِ نظم رشکِ سیاہیِ چشمِ ہوشاں، متانت و فطانت کا کلام، عاصی جس کا مشتاق لاکلام، بسرکارِ دولت مدار کیواں بارگاہ سپہرِ احتشام حضرت ظلِّ سبحانی مرزا ابوظفر بہادر دام سلطنتہ، جمہورِ شعراء میں ممتاز، کسی کا کیا لب و لہجہ جو بمقابلہ کلامِ فصاحت نظام اِس استادِ زماں کے زبان دراز ہو۔ شاگردِ شاہ نصیر، نصیر استاد سے بہتر تحریر، اِن کے کلام کا شایق ہر صاحب شوق، ہر صاحب شوق کو سُننے کا ذوق۔"

Marfat.com

صہبائی کی تحریر اِس کے مقابلے میں بہر طور لائقِ ترجیح ہے۔

کلیاتِ صہبائی میں صہبائی کا تیار کردہ یہ انتخابِ دواوین شامل نہیں ہے۔ شاید بعض دوسری کتابوں کی طرح یہ بھی مرتبِ کلیاتِ صہبائی منشی دین دیال کو دستیاب نہیں ہو سکا تھا۔

شیخ امام بخش صہبائی کے انتخابِ دواوین میں مرزا اسد اللہ خاں غالب کا ذکر نہیں ہے۔ بعض حضرات نے معاصرانہ چشمک یا تعصب پر محمول کر کے اِس کے لیے صہبائی کو الزام دینے کی کوشش کی ہے اِس لیے اِس مقام پہ صہبائی اور غالب کے روابط کا جائزہ لینا بھی مناسب معلوم ہوتا ہے۔

غالب اور صہبائی کے مشترک دوستوں میں آزردہ، شیفتہ اور سرسید خاص طور سے نمایاں تھے۔ بظاہر اِس باب میں شبہ کی گنجایش نہیں کہ گلشنِ بیخار کی تصنیف (۱۲۵۰ھ مطابق ۱۸۳۴ء) کے پہلے سے غالب اور صہبائی ایک دوسرے سے متعارف تھے اور دونوں کے مابین مثبت روابط تھے۔ صہبائی کے یہاں ایسے شعر بھی موجود ہیں جن میں از راہِ علم نوازی غالب کی صلاحیتوں کا اعتراف کیا گیا ہے مثلاً ؎

طاقتِ ہم طرحیِ غالب ندارد طبعِ من
بر پے اش رفتم، ز نقشش گردہ بر داشتم

منکسر مزاج، نیک سرشت اور ادب دوست صہبائی کا غالب کی شعری صلاحیتوں کو یہ خراجِ عقیدت ہے لیکن اِس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا کہ صہبائی فی الواقع عاجز و درماندہ تھے صحیح نہیں ہوگا۔

مرزا اسد اللہ خان غالب کا یہ شعر اکثر نقل کیا گیا ہے ؎

مومن و نیر و صہبائی و علوی و انگاہ — خسرتی اشرف و آزردہ بود اعظم خاں

Marfat.com

اِسی زمین میں صہبائی نے بھی کہا ہے ؎

نالۂ غالب و آزردہ ز کلک بُردعناں
سوختم سوختم از آتشِ گرمِ دمِ شاں

نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ کے نام ایک خط میں مرزا غالب نے ایک مشاعرے کی روداد بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

"جمعہ کی شب کو ۲۳ مارچ (ستہ درج نہیں) بزمِ سخن آراستہ ہوئی۔ میں نے طرحی زمین میں غزل نہیں کہی تھی اِس لیے مشاعرے میں جانا نہیں چاہتا تھا لیکن نواب ضیاء الدین احمد خاں نے نواب زین العابدین خاں عارف اور غلام حسن خاں محو کو دو فرشتوں کی طرح مجھ پر مقرر کر دیا۔ صہبائی نے طرحی زمین میں غزل پڑھی۔ دو تین شعر دلنشیں تھے۔۔۔۔۔۔ آئندہ مشاعرے کے لیے گریبانم نمی آید طرح ہوئی ہے۔۔۔" (بحوالہ غالب از مہر ص ۲۹۸)

صہبائی کی غزلیں عموماً پانچ سات شعروں کی ہوتی تھیں۔ اُن میں سے دو تین شعروں کو مرزا کا دلنشیں قرار دینا قابلِ توجہ بات ہے۔ اگلے مشاعرے کی طرحی غزل میں صہبائی نے آزردہ کے ساتھ ساتھ غالب کی بھی اِس طرح ستائش کی ہے ؎

چو دیدم غالب و آزردہ را از ہند صہبائی
بخاطر ہیچ یاد از خاکِ ایرانم نمی آید

اِسی زمانے کے ایک اور مشاعرے کا ذکر کرتے ہوئے مرزا غالب نے نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ کے نام لکھا،

"شام ہوئی تو وہی دو فرشتے یعنی عارف و محو آ کر مجھے لے گئے۔ میر نظام الدین ممنون اور مولوی امام بخش صہبائی

Marfat.com

بہ سبب علالت نہ آسکے" (بحوالہ غالب از مہر ص۹۹)

یہ مئی ۱۸۴۳ء کا واقعہ ہے۔ غالب کے بیانوں سے ہرگز یہ بات ظاہر نہیں ہوتی کہ اُن کے اور صہبائی کے مابین کسی درجہ میں بھی بگاڑ ہو گیا تھا کسی اور ذریعے سے بھی اُس وقت تک اِن دونوں باکمالوں کے درمیان رنجش یا کشیدگی کا ثبوت نہیں مل سکا اس لیے ہمارے لیے بھی مناسب نہیں کہ بغیر کسی دلیل کے ہم یہ خیال کر لیں کہ صہبائی نے کسی نوع کی ناراضی کی وجہ سے اپنے انتخابِ دواوین میں عمداً مرزا غالب کے کلام کو جگہ نہیں دی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ صہبائی کا انتخاب دواوین محض چیدہ شعرا کے کلام پر مشتمل ہے۔ یہ شعرائے اردو کا کوئی عام تذکرہ نہیں ہے جس میں اگلے پچھلے تمام شاعروں کا نام اور کلام لکھا جاتا۔ ایک غالب کیا، اِس میں کئی بڑے اہم شاعروں کا بھی ذکر نہیں ہے۔ انشا، مصحفی اور رنگین وغیرہ کے علاوہ خود بادشاہ یعنی بہادر شاہ ظفر کے کلام کا بھی انتخاب اِس میں شامل نہیں کیا گیا ہے۔ اِس انتخاب میں کسی شاعر کے کلام کی عدم شمولیت کا سبب اِس کے سوا کچھ نہیں کہ انتخاب کرنے والے کے اصولوں پر وہ پورا نہیں اترتا تھا۔ یہ انتخاب صہبائی نے پرنسپل بوترو کی فرمائش اور اُن کی نگرانی میں تیار کیا تھا۔ بخوبی ممکن ہے کہ شاعروں کے ناموں کے بارے میں فیصلہ اُنھیں کے مشورے سے کیا گیا ہو۔ مرزا اسد اللہ خاں غالب اِسی مدرسۂ دہلی میں مفتی صدر الدین خاں آزردہ کی تحریک

ع شیفتہ کے تذکرے گلشنِ بیخار میں صہبائی کا ذکر شامل نہیں ہے، باوجود اِس کے دونوں کے مابین عمدہ روابط تھے اور صہبائی نے اِس تذکرہ کے لیے تقریظ لکھی تھی جسے شیفتہ نے اِس میں فخریہ شامل کیا تھا۔

Marfat.com

پر فارسی کے عالم کی حیثیت سے مُلازمت کے اُمیدوار رہ چکے تھے۔
اِس کے علاوہ ایک وجہ یہ بھی ہے کہ مرزا ابتدائی زمانے میں اپنے کلام کی دقت کے لیے مشہور تھے اور اُن کے اُس دقیق کلام کو نصاب کے تقاضوں کے مطابق خیال نہ کیا گیا ہو۔

صہبائی جیسے نیک سرشت شخص نے اپنی زندگی کے کسی حصہ میں بھی مرزا اسد اللہ خاں غالب کے خلاف نہ تو نامناسب کلمات سے زبان و قلم کو آلودہ کیا اور نہ کوئی ایسا اقدام کیا جس سے خود اُن کی ذات پہ الزام آتا۔ یہ واقعہ ہے کہ مرزا کی شوخیاں اور جملہ بازیاں صہبائی کی سادگیِ طبع پر گراں گذرتی رہی ہونگی اور اُن سے خود کو محفوظ رکھنے کی کوشش صہبائی ضرور کرتے ہونگے چنانچہ مختلف کتابوں میں اِس قسم کے لطیفے منقول ہیں مولوی محمد بشیر الدین احمد ناقل ہیں:

"مولانا امام بخش کی رائے پنج رقعہ اور مینا بازار کی نسبت یہ تھی کہ یہ دونوں تحریریں مثل سہ نثر مُلّا ظہوری کی ہیں مگر مرزا اس کے خلاف تھے۔ ایک جلسہ میں دونوں صاحب موجود تھے۔ اتفاق سے ذکر چھڑ گیا۔ مرزا نے کہا کہ

عہ پنج رقعہ کو عام طور سے ظہوری ترشیزی سے ہی منسوب کیا جاتا ہے البتہ "در بعضے چاپ ہائے پاکستان و ہند این رقعات بہ ارادت خاں واضح نسبت دادہ شدہ است" (فہرست موزۂ ملی ص۴۴) بالکل یہی معاملہ مینا بازار کا بھی ہے کہ اِسے بھی عموماً ظہوری ہی کی تصنیف خیال کرتے ہیں اور "در بعضے چاپہائے ہند این رسالہ بہ ارادت خاں واضح نسبت دادہ شدہ است" (ایضاً ص۴۴۲) اِن دونوں کتابوں کی شرح صہبائی سے پہلے عبدالرزاق سورتی نے لکھی تھی اور وہ بھی اِن کو ظہوری ہی کی تصنیف مانتا تھا۔

Marfat.com

یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ جو شخص نظم و نثر دونوں پر قادر ہو اُس کی نثر میں کہیں نظم نہ پائی جائے۔ مولانا صہبائیؔ نے کہا ایسے اتفاق اکثر ہو جاتے ہیں۔ یہ محض ایک اتفاق کی بات ہے۔ مرزا نے کہا، بے شک، مگر یہ ایسا اتفاق ہوگا کہ ایک شخص ہر ایک لحاظ سے نہایت سنجیدہ اور معقول آدمی ہے مگر اتفاق سے کبھی کبھی کاٹ بھی کھاتا ہے[1]" (واقعات ۲/ صفحہ)

یہ ذکر آچکا ہے کہ علمی معاملوں میں صہبائی خاموش رہ جانے والوں میں نہیں تھے لیکن جس جگہ بحث کا انداز علمی نہ ہو وہاں خاموشی ہی بہتر تھی۔ اگر اس واقعے کی صحت تسلیم کر لی جائے تو یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ صہبائیؔ مرزا سے اُلجھنا نہیں چاہتے تھے۔

مولانا محمد حسین آزاد نے بھی اِسی نوعیت کا ایک قصہ اِس طرح بیان کیا ہے:

"دہلی میں مشاعرہ تھا۔ مرزا نے اپنی فارسی غزل پڑھی۔ مفتی صدرالدین خاں صاحب آزردہ اور مولوی امام بخش صاحب صہبائیؔ جلسہ میں موجود تھے۔ مرزا صاحب نے جس وقت یہ مصرع پڑھا ؎

بوا دیئے کہ دراں خطہ را عصا خفت است

مولوی صہبائی کی تحریک سے مفتی صاحب نے فرمایا کہ عصا خفت است میں کلام ہے۔ مرزا نے کہا کہ حضرت

---

[1] یہ مثال مناسب مقام نہیں ہے۔ کاٹ کھانا ایک فعلِ زاید ہے۔ نظم کا نہ ہونا اِس کے برخلاف ہے۔

Marfat.com

میں ہندی نژاد ہوں، میرا عصا پکڑ لیا، اُس شیرازی
کا عصا پکڑا گیا۔ ع

و لے بجملۂ اول عصائے شیخ خفت است (کذا)

اِنھوں نے کہا کہ اصل محاورہ میں کلام نہیں۔ کلام اِس
میں ہے کہ مناسب مقام ہے یا نہیں۔" (آبِ حیات ص۵۵۰)

اِس سے بھی یہی ظاہر ہے کہ صہبائی مرزا سے کتراتے تھے اور اُن سے براہِ راست مخاطبت سے خود کو بچاتے تھے۔ یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ اس قسم کی جملہ بازی سے قطع نظر صہبائی کے خلاف مرزا کی جتنی بھی تحریریں ملتی ہیں غالباً وہ سب صہبائی جنت مأوائی کی شہادت کے بعد کی ہیں۔ صہبائی کی زندگی میں مرزا نے بھی شاید اُن کی عالمانہ شخصیت کے خلاف کوئی بات نہیں لکھی تھی۔

انتخابِ دواوینِ شعرائے اُردو کی تکمیل سے فرصت پانے کے بعد پرنسپل بوترو کی فرمائش سے شیخ امام بخش صہبائی نے زبانِ اُردو کی قواعد لکھنے کا کام شروع کیا۔ ترجمۂ حدایق البلاغت کو جو قبولِ عام حاصل ہو چکا تھا اُس نے اُن کے حوصلوں کو بہت بلند کر دیا تھا چنانچہ اپنی قواعد کی کتاب کے سببِ تالیف میں اُنھوں نے لکھا ہے:

"اَلحق کہ حدایق البلاغت شمس الدین فقیر کی کہ عبارت اُس کی فارسی ہے طالبعلموں کے سوا کوئی ہاتھ میں نہیں لیتا تھا اور جب سے اِس احقر نے بموجب فرمائش صاحب ممدوح (بوترو صاحب بہادر پرنسپل مدرسہ) کے اُردو میں ترجمہ کیا، اکثر کم استعدادوں نے جن کو فنِ شعر سے مناسبت تھی، اِس کو بہم پہنچا کر کچھ کچھ

Marfat.com

فایدہ اُٹھایا۔"

صہبائی کہ جنھوں نے علم کی اشاعت و ترقی کے لیے خود کو وقف کیے رکھا تھا، اِس بات سے بہت خوش معلوم ہوتے ہیں کہ اُن کی کتاب سے طالب علم اور دوسرے لوگ فایدہ حاصل کر رہے تھے۔ چنانچہ جس وقت :

(پرنسپل صاحب موصوف نے) اِس احقر سے ارشاد کیا کہ اُردو کی صَرف اور نحو کے قواعد میں ایک رسالہ تالیف کرے۔"

تو وہ دل و جان سے اِس کام میں مصروف ہو گیے اور بہت جلد اسے مکمل کر ڈالا اِس کتاب کے ابواب کی تفصیل بیان کرتے ہوئے اُنھوں نے لکھا ہے :

"اِس واسطے احقر نے اِس رسالے کو ایک مقدمہ اور چار باب پر مرتب کیا :

مقدمہ : زبانِ اُردو کی تحقیق میں اور جو اُس سے متعلق ہے ؛

پہلا باب۔ علمِ صَرف میں ؛

دوسرا باب۔ علمِ نحو میں ؛

تیسرا باب : لُغت میں

چوتھا باب : مثلوں کے بیان میں "

مقدمہ کے شروع میں صہبائی نے زبانِ اُردو کے آغاز اور ارتقا کی کیفیت مختصراً بیان کی ہے۔ یہ اُس وقت تک کے مُروّجہ خیالوں کا اعادہ ہی نہیں ہے بلکہ ایک صاحب علم زبان دان کے سوچے سمجھے ہوئے نقطۂ نظر کا اظہار ہے۔ تاریخی حیثیت سے بھی یہ بحث لایق توجہ ہے

Marfat.com

اِس جزو میں صہبائی نے اُردو تحریر کے مسایل کا بیان بھی کیا ہے۔
صہبائی سے بہت پہلے شاہ عالم اول کے عہد میں میرزا روشن ضمیر نے اپنے مختصر رسالے "سر ضابطۂ ہندی" میں کہا تھا کہ:
"کلامِ ہند ---- بخطِ فارسی نوشتن آساں و خواندن مشکل"
اور اُس نے اُردو تحریر کے لیے تین ضابطے تجویز کیے تھے۔ اب صہبائی نے دہلی کالج میں انگریز پرنسپل کی سرپرستی میں انگریزی تحریروں کی مناسبت سے اُردو تحریر کے لیے بعض ایسے ضابطے مقرر کرنے کی کوشش کی کہ بقول اُن کے،
"اُس کی مدد سے عبارت خوانی آسان ہو جاتی ہے"
اِس کوشش میں صہبائی نے تحریر میں استعمال کرنے کے لیے چند علامتیں تجویز کیں۔ اِن میں بیشتر وہ ہیں جو بجنسہٖ انگریزی میں رائج تھیں مثلاً:
دو واو معکوس یعنی "_____"
اور فاصلہ یعنی !
وغیرہ بظاہر یہ انگریزوں کی صحبت اور انگریزی ماحول کا فیض تھا۔
صہبائی کی ایجاد پسند طبیعت نے کاملاً انگریزی کی اتباع نہیں کی بلکہ جس طرح اُنھوں نے ترجمۂ حدایق البلاغت میں فارسی کے ضابطوں کو اُردو پر ڈھال لیا تھا اُسی طرح یہاں انگریزی علامتوں کو اُردو کی ضرورت کے مطابق بنا لیا مثال کے طور پر اُردو میں جس جگہ پر جملہ ختم ہوتا ہے صہبائی نے انگریزی کے لفظ (FULL-STOP) کے بجاے اُردو میں ایک مختصر خط بنانا تجویز کیا۔ یہ علامت آج بھی رائج ہے۔
سوال یا استفہام کے لیے صہبائی نے نو کے ہندسے کے نیچے ایک نقطہ

Marfat.com

بنانا تجویز کیا اِس طرح ــــ ؎ زمانۂ حال میں اِس مقام پر انگریزی کی مقررہ علامت ہی اپنے رُخ کی تبدیلی کے ساتھ رائج ہوئی، اِس طرح ؟ غور کریں تو یہ صورت صہبائی کی تجویز کردہ علامت سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہے جو بھی ہو صہبائی کی کتاب کا یہ جزو نہایت وقیع ہے اور اِس کے لیے اُردو تحریر ہمیشہ اُن کی احسان مند رہیگی۔

صہبائی کی اُردو عبارتوں پر غور کریں تو معلوم ہوگا کہ عملاً جملوں کی ساخت وغیرہ کے معاملوں میں وہ فارسی کی تقلید سے آزاد ہو چلے تھے اور فاعل مفعول اور فعل کی ترتیب کے علاوہ مضاف، مضاف الیہ وغیرہ کے لانے میں وہ عموماً اُردو کی بول چال کی پابندی کرتے تھے لیکن بنیادی طور سے وہ فارسی کے عالم تھے اِس لیے اُردو کی قواعد مرتب کرتے وقت وہ فارسی کے اصولوں کو فراموش نہ کر سکے اور صرف و نحو کے بیان میں اُنھوں نے دستورِ زمانہ کے مطابق "قواعدِ فارسیہ" کی پابندی کی ہے۔

اُردو کی صَرف و نحو کی تدوین کے معاملے میں صہبائی کو اوّلیت حاصل نہیں ہے۔ دوسرے مقاموں سے قطع نظر خود دہلی میں ایک سے زاید لوگ اِس موضوع سے متعلق ابتدای کام کر چکے تھے۔ صہبائی کا امتیاز یہ ہے کہ اُن کا کام نسبتاً زیادہ مفصل ہے اور اُنھوں نے بہرحال اہلِ زبان کے روزمرّہ کو اہمیت دی ہے۔ فارسی کی تقلید کے لیے صہبائی کو مطعون کرنا درست نہیں کیونکہ اُن کے بعد ایک مدّت تک (بلکہ بعض معاملوں میں آج تک) اُردو کے قواعد نویس اِس سے خود کو آزاد نہیں کر سکے ہیں۔

پرنسپل بوٹرو نے انگریزی گرامر کی کتابوں کی روش پر صہبائی سے یہ فرمائش بھی کی تھی کہ اپنی کتاب میں وہ :

"اخیر میں بطریق اختصار کے چند لغت اور اصطلاح اور محاورہ زبانِ اُردو اور مثلیں جو اکثر زبان زد ہیں، بھی مندرج کریں۔"

Marfat.com

اِسی فرمائش کی تعمیل میں صہبائی نے تیسرا اور چوتھا باب لکھا تھا۔ تیسرے باب میں صہبائی نے جو بحثیں کی ہیں اُن سے پتا چلتا ہے کہ وہ اہلِ علم کی بول چال کو اہمیت دیتے تھے اور چاہتے تھے کہ اُس کی اتباع کی جائے۔ زبان کے بارے میں اُن کا نقطۂ نظر بہت واضح اور قطعی تھا۔ لکھتے ہیں:

"ایرانی نژادے اگر صد سال در ہند بگذارند در فصاحت زبانِ اُردو با چہار سالہ طفلکے بر نیاید" (قولِ فیصل ص۴)

وہ روزمرّہ کو بہت اہمیت دیتے تھے چنانچہ ذیل کے اقتباس سے ظاہر ہے:

"لہو خون۔ یہ مخفف ہے لوہو کا لیکن بغیر واو کے مستعمل ہے۔[1] شیخ ابراہیم ذوق کا شعر ؎

ہمارا پی کے لہو تیرے تیر کا سوفار
یہ چپ ہوا ہے کہ گویا نہیں زباں مُنہ میں"

(رسالہ قواعدِ صرف و نحو ص۲۰۰)

کتاب کے پہلے اور دوسرے باب میں بھی اِس قسم کی بحثیں مل سکتی ہیں مثلاً

"ہوویگا زیادہ، تر فصاحت رکھتا ہے اور ہوئیگا کم، اگرچہ شعر میں شیخ ابراہیم ذوق سلمہ اللہ تعالیٰ کے جو راقم کے الطاف گسترانِ شفیق میں سے ہے بندھا ہوا ہے ؎

ہوئیگا کشتیِ طوفاں زدہ تابوت اپنا آگیا اپنے اگر مرنے پہ رونا ہم کو"

(ایضاً ص۳۰)

اِسی طرح ذیل کا اقتباس بھی ہے:

"آے ہے ..... آو ہو ..... اگرچہ عوام شاہجہاں آباد

---

[1] لہو مضموم الاول ہے اِسے بعض لوگ بہ فتحۂ اول تلفظ کرتے ہیں جو درست نہیں

Marfat.com

کے ان الفاظ کو اکثر محاورے میں بھی استعمال کرتے ہیں لیکن فصحا یہاں کے کم بولتے ہیں اور اُن کے کلام میں پایا جاتا ہے تو بر سبیلِ شاذ جیسے اِس شعر میں شیخ ابراہیم ذوق سلمہ اللہ تعالیٰ کے ؎

واہ رے شورِ محبت خوب ہے چھڑکا نمک
استخواں میرے ہما کس کس مزے سے کھا ہے "

(ایضاً ص ۳۱)

یہ بڑی بات ہے کہ نہایت دوستی اور اتحاد کے باوجود صہبائی نے ذوق اور اپنے دوسرے دوستوں کے کلام سے ہی مختلف قسم کے اسقام کے لیے مثالیں تلاش کی ہیں بڑی خوبی یہ بھی ہے کہ علمی بحثوں میں انھوں نے اپنی یا دوسروں کی ذات کو داخل نہیں کیا ہے۔ اِس کی مثال عہدِ صہبائی ہی میں نہیں، آج بھی کمیاب ہے۔

"رسالۂ قواعدِ صرف و نحوِ اُردو" کے چوتھے باب میں صہبائی نے پرنسپل کی ایما سے اُردو کے محاورات اور ضرب الامثال جمع کیے ہیں۔ امثال کے جمع کرنے کی پہلی کوشش غالباً شاہ برکت اللہ پیمی نے کی تھی۔ اپنے مختصر سے فارسی رسالے "عوارفِ ہندی" میں پیمی نے ہندی امثال کے مطالب کی تصوّف کے معاملوں اور ضابطوں کے مطابق توضیح و تشریح کی تھی۔ یہ کام پیمی کے بعد بھی کیا گیا ہوگا لیکن قواعد کی کتاب کے ایک جزو کے طور پہ اُردو میں ضرب الامثال کی تشریح کا کام سب سے پہلے صہبائی ہی نے کیا ہے۔ اُن کی اِن تشریحات کا نمونہ ذیل کے اقتباس میں موجود ہے:

"دکھن گیے نہ بارہ برسے اور رہے چندیری چھاے۔
مشہور ہے کہ چونکہ دکھنی ملک زرخیز ہے، زمانۂ سابق

Marfat.com

میں اطراف اور جوانب سے جب کوی دکھن گیا بہ سبب
حصولِ زر کے تمام عمر اپنی اوقات وہیں بسر کی اور معاودت
اپنے گھر کی طرف اُس کو میسّر نہ آی اور ایک وجہ اِس
میں بُعدِ مسافت بھی ہے۔" (رسالۂ قواعد ص۲۲۶)

چندیری کسی زمانے میں ریاست مالوہ کا ایک اہم شہر تھا۔ اب صوبہ مدھ پردیس میں ہے۔ مذکورہ مثل کا مطلب یہ ہوا کہ جو شخص دکھن گیا وہ پھر لوٹ کر نہیں آیا۔ اگر وہاں سے گھر کی طرف چلتا ہے تو چندیری میں آکر رہ پڑتا ہے۔ ضرب الامثال کی زبان اصل سے بہت زیادہ مطابق ہوتی ہے اِس لیے اگر اِن کا صحیح طور سے تجزیہ کیا جائے تو اردو زبان کی اصل کے تعین میں بہت مدد مل سکتی ہے۔

شیخ امام بخش صہبائی کی دوسری کتابوں کی طرح اُن کا رسالہ قواعدِ صرف و نحو اردو بھی زبانِ اردو کے طالب علموں کے لیے نہایت مفید ثابت ہوا۔ گارسن دتاسی نے ۱۸۵۵ء کے اپنے خطبہ میں اِس کے بارے میں کہا تھا:

"اِن کی قواعدِ اردو اِس وجہ سے اور بھی زیادہ قابلِ قدر ہے کہ اِس کے آخر میں ضرب الامثال اور محاورات کی ایک فہرست درج ہے۔" (خطبات ص۱۸۸)

اِس کتاب کا پہلا ایڈیشن ۱۸۴۵ء مطابق ۱۲۶۱ھ میں سید محمد خاں مالک سید الاخبار کے چھاپے خانے سے چھپ کر شایع ہوا تھا اُس کے سرِ ورق کی عبارت حسب ذیل تھی:

رسالۂ قواعدِ اُردو
مشتمل اوپر چار باب کے
باب اول علمِ صرف، باب دوم علمِ نحو، باب سویم لغاتِ زبانِ اردو

Marfat.com

باب چہارم امثال

تصنیف کیا ہوا مولوی امام بخش مدرّس اوّل مدرسۂ فارسی سے جناب محمد خاں بہادر کے چھاپہ خانے کے لیتھو گرافک پریس میں تیری مئی ۱۸۴۵ء سید عبدالغفور کے اہتمام سے چھپا"

انگریزی میں کتاب اور مصنف کا نام اِس طرح تحریر تھا:

A Grammer of The Urdoo Languagin
Urdoo BY.
moulvi Imam BUX of The Delhi collge

اس کا دوسرا اڈیشن چار برس بعد چھپا۔ سرورق کی عبارت وہی رہی البتہ مطبع وغیرہ کا نام اس طرح لکھا گیا:

"باہتمام سیدا شرف علی، مطبع العلوم واقع دہلی کشمیری دروازہ میں چھپا۔ ۹ لم ۱۸ء"

لیکن افسوس ہے کہ صہبائی کی دوسری کتابوں کی طرح یہ کتاب بھی اب نہایت کمیاب ہے۔

ڈاکٹر ابواللیث صدیقی نے شیخ امام بخش صہبائی کی قواعد کی کتاب کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

"روگارسن خبردار کرتا ہے کہ صہبائی کی قواعدِ اُردو کو ان کی ایک اور تصنیف قاعدۂ اردو سے خلط ملط نہیں کرنا چاہیے۔ اِس آخرالذکر نام سے اُنھوں نے اُردو کی تعلیم و تدریس کے لیے ایک ابتدائی کتاب لکھی تھی جس میں اُردو کے حروفِ تہجی سے بحث کی گئی تھی۔ یہ کتاب صہبائی نے کالج کی ملازمت کے دوران لکھی اور قیاس ہے کہ یہ

Marfat.com

کالج کے طلباء کی تدریس کے لیے لکھی گئی ہو گی۔"

(جامع القواعد، صرف ص ۱۷۶)

ڈاکٹر موصوف کے لفظوں سے صاف ظاہر ہے کہ جن کتابوں کا وہ ذکر کر رہے ہیں اُن کو اُنھوں نے خود دیکھا نہیں تھا۔ گارسن دتاسی کے خطبات میں بھی وہ بات ہمیں نہیں مل سکی جس کا ڈاکٹر صاحب نے ذکر کیا ہے۔ اُس نے کہا ہے۔

"اُردو صرف و نحو پر کئی کتابیں لکھی گئی ہیں جن میں سے ایک صہبائی کی ہے اُن کی زباندانی اور زبان پر اور تالیفات بھی ہیں"۔ (خطبات ص ۱۶۴)

افسوس ہے کہ صہبائی کی مذکورہ تین کتابوں یعنی ترجمۂ حدائق البلاغت انتخابِ دواوین شعرائے اُردو اور رسالۂ قواعدِ صرف و نحوِ اردو کے علاوہ اُردو زبان سے متعلق اُن کی کسی اور کتاب کا کہیں مذکور سننے میں نہیں آیا۔

۱۸۴۵ء میں پرنسپل بوترو بیمار ہوئے۔ صحت کی خرابی کی وجہ سے مدرسۂ دہلی کی ملازمت چھوڑ کر آنھیں یوروپ واپس جانا پڑا اُن کی جگہ ڈاکٹر اسپرنگر (ALOIS SPRENGER) کا تقرر عمل میں آیا۔ اِن کی علم دوستی میں شبہ لیکن اسپرنگر کے زمانے میں تصنیف و تالیف کا وہ سلسلہ جاری نہیں رہ سکا۔ سوسائٹی کی ۱۸۴۶ء کی رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ:

"جب بمبئی اور دوسرے مقامات کے علاوہ لکھنؤ میں بارہ اور دہلی میں سات سنگی مطبع ہیں اور وہ ایسی مقبول کتابیں شایع کرتے ہیں جو لوگ پسند کرتے ہیں تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ دہلی سوسائٹی اِس قسم کی کتابیں

Marfat.com

طبع کر کے اُن سے مقابلہ کرے۔" (مرحوم دہلی کالج ص۱۳۶)

پرنسپل بوئرو کے بعد شیخ امام بخش صہبائی کے اِن کاموں کی غائبًا پہلی جیسی پذیرائی نہیں ہو سکی۔ اِس لیے اُنھوں نے اُردو میں تصنیف وتالیف کے سلسلے کو جاری نہیں رکھا اور پھر اپنے اصل شوق یعنی فارسی کی کتابوں کے لکھنے میں ہمہ تن مشغول ہو گئے۔

Marfat.com

بہ زبانِ فارسی

یہ خیال نہ ہونا چاہیے کہ پرنسپل بوتنرو کے زمانے میں صہبائی نے فارسی میں لکھنا چھوڑ دیا تھا۔ اُس وقت بھی وہ فارسی میں اپنی دلچسپی کے کام کرتے رہے تھے۔ اُس مدت کی اُن کی جو تصانیف دستیاب ہیں اُن کی کیفیت اس طرح ہے:

فارسی کے ایک شاعر مُلّا کوکبی کے ایک شعر کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ اُس سے سینتیس ۳۷ نام نکلتے ہیں۔ صہبائی نے اُن ناموں کا استخراج کر کے دکھایا اور استخراج کے طریقوں کو بھی قلمبند کر دیا۔ اِس طرح جو رسالہ مرتب ہوا اُس کا نام اُنھوں نے "رسالۂ نادرہ" مقرر کیا۔ اِس رسالے کی تاریخ بھی اُنھوں نے عملِ معمای کے ساتھ کہی تھی یعنی ؎

از روے غربت آمدش نادرہ نام

روے غربت "یعنی "غ" ۱۰۰۰ کے عدد کو اگر لفظ "نادرہ" ۳۶۰ کے عددوں میں جمع کر دیں تو ۱۲۶۰ حاصل ہو گئے اور یہی اِس کا سالِ تصنیف ہے۔ یہ مختصر رسالہ صرف پندرہ صفحوں پر محیط ہے اور اِس کے آخر میں ولیعہد بہادر مرزا فتح الملک کی مدح میں ایک قصیدہ بھی شامل ہے

Marfat.com

اِس قصیدے سے معلوم ہوتا ہے کہ صہبائی کو ولیعہد کی سرکار میں رسائی حاصل تھی۔

رسالۂ نادرہ کے بعد فنِ معمّا ہی سے متعلق صہبائی نے ایک اور رسالہ گنجینۂ رموز کے نام سے لکھا۔ اِسے بھی اُنھوں نے ۱۲۶۰ھ مطابق ۱۸۴۴ء ہی میں مکمل کر لیا تھا۔ اِس کی ضخامت ۱۳۱ صفحوں کی ہے۔

سر سید احمد خاں نے اِس رسالے کا ذکر کرتے ہوے لکھا ہے:

"رسالہ گنجینۂ رموز کہ صنعتِ معمّا میں آپ کے خامۂ معنی طراز سے جلوہ پرداز ہوا ہے، ہر چند رسایلِ متعدّدہ اِس فن میں اساتذۂ سلف سے یادگار ہیں جو کہ ع

ہر کار رہینِ روزگار یست۔ حسن اِس کمال کا اب گنجینۂ تقدیر میں سر بمہر امانت تھا۔۔۔۔ تفصیل اِس اجمال کی یہ ہے کہ وہ رسالہ مشتمل ہے ایک معمّا کی شرح پر کہ شرح و متن دونوں آپ ہی کے نتایجِ طبعِ فیاض سے ہیں وہ بیت باعتبار ظاہر کے سوائے چند کلماتِ معدود جو ظرفِ بحور متعارف میں گنجایش پذیر ہو سکتے ہیں اور کیا رکھتی ہے لیکن۔۔۔۔ اُس بیت کے باوجود ایسی تنگ ظرفی کے اِس دریاے زخار کو اپنے آغوش میں چھپایا ہے یعنی ذیلِ بیانِ اعمال میں یہی ایک مثال ہے اور اِس سے تین سو ساٹھ ۳۶۰ مختلف اسامی مستخرج ہوتے ہیں اور طرفہ تر یہ ہے کہ استخراج اِس کا نہایت سہولت و بے تکلفی کے ساتھ ہے۔ اگر انصاف یارانِ سخن فہم کی طبیعت سے گوشہ گیر نہ ہو تو ارشاد کریں کہ اِس کیفیت کے ساتھ کوی رسالہ عہدِ آدم سے اِس دم تک کسی صاحب استعداد کے پردۂ فکر سے جلوہ گر ہوا ہے؟" (اہلِ دہلی ص ۱۳۹)

Marfat.com

خود شیخ امام بخش صہبائی نے رسالۂ گنجینۂ رموز میں سببِ تالیف لکھتے ہوئے ضمناً فنِ معمّا سے اپنی دلچسپی کا حال بھی قلمبند کر دیا ہے۔ اُس کا خلاصہ اِس طرح ہے:

"جب میرے دل میں تحصیلِ معمّا کی خواہش پیدا ہوی تو میں نے اس فن کے علماے متقدمین سے گدای کی۔ شرف الدین علی[1] یزدی صاحب حلل مطرز نیز مولانا جامی[2] اور میر حسین[3] نیشاپوری کے نظمِ کلام کے پسندیدہ اسلوب نے مجھے ایسا لبھایا کہ میں نے مولانا جامی کے رسالہ معماے[4] منظوم کی شرح لکھی اور اُن کے کلام کے تتبع میں خدا کے ننانوے ۹۹ ناموں پر ڈیڑھ سو ۲۰۰ سے اوپر معمّای رباعیاں کہیں۔ اِس اثنا میں لوگوں نے مجھے ایک ایسا گوہر دکھایا جس کی روشنی بلند نظر رکھنے والوں کی آنکھوں کو خیرہ کرتی تھی۔ میری مُراد مُلّا کوکبی کی اُس

عـ۱ شرف الدین علی یزدی (متوفی ۸۵۸ھ/۱۴۵۴ء) جس نے ۸۲۸ھ/۱۴۲۵ء میں ظفرنامۂ تیموری کے نام سے ایک کتاب وقایع سے متعلق لکھی تھی۔

عـ۲ عبدالرحمٰن جامی (متوفی ۸۹۸ھ/۱۴۹۳ء) جس نے حلیۃ الحلل کے نام سے ایک رسالہ ۸۵۶ھ/۱۴۵۲ء میں لکھا تھا جس میں معمّا کی حقیقت اور اصول بیان کیے تھے۔

عـ۳ میر حسین بن محمد حسینی نیشاپوری (متوفی ۹۰۴ھ/۹۹-۱۴۹۸ء) جس نے چار ابواب پر مشتمل ایک رسالہ دستورِ معمّا کے نام سے مرتب کیا تھا۔

عـ۴ رسالہ معماے اصغر (منظوم) جامی نے ۸۹۰ھ/۱۴۸۵ء میں نظم کیا تھا اس میں "اعمال سہ گونۂ معما" کا بیان ہوا ہے۔ اِس کا سال تصنیف کلمہ "فیض" سے حاصل ہوتا ہے۔

Marfat.com

بیت سے ہے جس سے اُس نے اعمالِ معمّای کے ذریعے تین سو
سے اوپر نام استخراج کیے ہیں۔ اُس کے مشاہدے سے میرے
چہرے کا رنگ فق ہو گیا اور دماغ میں عقل معطّل ہو گئی لیکن
پھر عالم قدس کے خزانے سے میری فہم نے وہ گوہر پایا کہ دونوں
جہانوں کا حاصل اُس کی قیمت کے ہزارویں حصے
کے برابر بھی نہیں چنانچہ میں نے تین سو نام اُس کے
الفاظ سے استخراج کیے۔۔۔۔۔"

(بحوالہ امام بخش صہبائی ۱۳۲ تا ۱۳۵)

اِس اقتباس میں صہبائی نے ڈیڑھ سو سے زیادہ معمای رباعیوں کے کہنے کا ذکر کیا ہے لیکن اُن کے رسالہ جواہرِ منظوم میں صرف ایک سو تیس ۱۳۰ رباعیاں ہیں۔ ظاہر ہے یہ جواہرِ منظوم سے مختلف کسی اور رسالے کا مذکور ہے۔

مُلّا کوکبی کا وہ شعر جس کا اِس اقتباس میں ذکر ہے جب صہبائی کو دکھایا گیا تو اُنھوں نے اُس سے متعلق رسالۂ نادرہ لکھ کر گویا اُس کی تشریح کر دی تھی لیکن اُسی زمانے سے وہ خود غور و فکر کرتے رہتے تھے اور بالآخر وہ شعر موزوں کر لیا جس سے اُنھوں نے ساڑھے تین سو سے زاید اسما کا استخراج کر کے دکھایا اور اِس کے بیان میں ایک نیا رسالہ مرتب کر لیا۔ شعرِ مذکور کی معنویت پر خیال کر کے اُنھوں نے اِس رسالے کا نام گنجینۂ رموز مقرر کیا۔ اِس میں شبہ نہیں کہ اُس وقت تک فنِ معمّا سے متعلق جو کام ہوا تھا اُس میں یہ رسالہ بے مثال تھا۔ لیکن صہبائی کی فکر کی حد یہیں اور آگے تک جاتی تھی۔ چنانچہ اِس باب میں اُن کا جو شاہکار بعد میں وجود میں آیا اُس کا حال آگے

Marfat.com

بیان ہوگا۔ رسالہ گنجینۂ راز میں صہبائی نے اعمالِ معمای کو بڑی شرح وبسط سے بیان کیا ہے اور ہر عمل کی تفہیم میں ایک نیا نام شعر مذکورے نکال کر مثال میں پیش کر دیا ہے۔

اِسی سال میں صہبائی نے ایک اور بڑا علمی کارنامہ انجام دیا، اور وہ ہے سہ نثرِ ظہوری کی شرح۔ ظہوری کی سہ نثر دراصل اُس کے لکھے ہوئے تین دیباچوں کا مجموعہ ہے جو درج ذیل ہیں۔

۱۔ ابراہیم عادل شاہ ثانی بادشاہِ بیجاپور کی کتاب "نورس" کا دیباچہ

۲۔ خود ظہوری کی مرتب کردہ بیاضِ گلزارِ ابراہیم کا دیباچہ اور

۳۔ ظہوری کے مجموعۂ اشعار خوانِ نعیم کا دیباچہ

شیخ امام بخش صہبائی کے زمانے میں سہ نثرِ ظہوری کی وہ شرح پڑھی پڑھائی جاتی تھی جو عبدالرزاق بن محمد اسحاق حسینی سورتی نے ۱۲۱۲ھ/۱۷۹۷-۹۸ء میں لکھی تھی۔ صہبائی اُس شرح سے مطمئن نہیں تھے اِس لیے وہ خود ایک شرح لکھنا چاہتے تھے۔ اپنی شرح میں لکھتے ہیں:

"مدتے ست تصمیمِ ارادۂ صہبائیِ بوالفضول عروجِ مدارجِ آرزو میداد کہ بہ جہتِ استفادۂ طالبانِ عمانی نہاد، مقاماتِ سہ نثرِ ملّا نورالدین ظہوری کہ خزینۂ نقودِ فصاحت و گنجینۂ بلاغت است، طرازِ دامنِ تحریر ساختہ شاید اشکالِ آنرا بہ خطوطِ عبارتِ شرحِ مخلوط نماید۔"

چنانچہ ایک ایک کرکے اُنھوں نے ظہوری کے تینوں نثر پاروں کی شرح لکھ ڈالی۔ تینوں شرحوں کے لیے صہبائی نے الگ الگ دیباچے اور خاتمے بھی لکھے۔ منشی دین دیال نے اِن دیباچوں اور خاتموں کو "بیاضِ شوق پیام" کی ترتیب میں بھی شامل کر لیا ہے۔ اِس شرح میں صہبائی نے خاص طریقہ کار اختیار کیا ہے۔ اُس کا ذکر مصنف نے اِن لفظوں

Marfat.com

میں کیا ہے:

"نخست عبارتے یا بیتے را آوردہ، سپس بہ شرحِ لغوی و ادبیِ آں می پردازد و دراں از سرودہ ہائے دیگراں گواہ می آورد۔"

اِس کی مثالیں ذیل کی عبارتوں میں دیکھی جائیں:

از شرحِ دیباچۂ نورس: "سُرود بہ ضمِ اول و واو ہم مجہول و ہم معروف ماضی است۔"

از شرحِ گلزارِ ابراہیم: "خُرّم بضمِ اول و تشدیدِ ثانی بدونِ واو بمعنی شاداں و خوشوقت۔۔۔"

از شرحِ خوانِ خلیل: "اِکلیل بالکسر تاج و چیزے ست مانند سربند کہ مزیّن بجواہر باشد۔"

سہ نثر ظہوری کی شرح لکھتے وقت صہبائی نے صرف اُس کے مشکل مقاموں کا حل ہی پیش نہیں کیا بلکہ نثرِ ظہوری کے مشتبہ مقاموں کی تصحیح بھی کی ہے اِس سے اُن کی طبیعت کی احتیاط پسندی کا ثبوت ہی نہیں ملتا ہے بلکہ یہ بھی پتا چلتا ہے کہ صہبائی اِس نکتہ کو اچھی طرح سمجھتے تھے کہ امتدادِ زمانے سے قدیم متون میں کچھ کچھ تصرف بھی ہو گیے ہیں اور جب تک متن کی مستند نسخوں کی مدد سے تصحیح نہ کر دی جاے، محض مروّجہ صورت پر اعتماد کر کے کوئی حکم لگا دینا یا نتیجہ نکال لینا درست نہیں ہوتا۔ صہبائی نے متن کی تصحیح کر کے آیندہ کام کرنے والوں کو ایک عمدہ راہ دکھا دی تھی چنانچہ اُن کے عزیز دوست سرسید احمد خاں نے بھی زمانۂ مابعد میں ایک سے زاید قدیم کتابوں کی تصحیح کا کام انجام دیا تھا۔ صہبائی کو اپنے اِس کام کی اہمیت کا بہت اچھی طرح سے اندازہ تھا۔ اُنھوں نے شرحِ نثر میں "مبصرانِ باریک بیں" سے خطاب کر کے کہا تھا کہ:

Marfat.com

"اگر آپ دیدۂ انصاف سے دیکھیں گے تو سمجھ جائیں گے کہ میں نے اِس کے معنی لکھنے میں مصنّف کی دِقتِ نظر سے کم کام نہیں لیا ہے۔ نیز یہ محسوس کریں گے کہ جو مقامات کاتبوں کی کم سوادی سے غیر مربوط ہو گئے تھے اُن میں سے بعض بعض کی تصحیح میں سخت محنت اٹھانی پڑی ہو گی۔"

(بحوالہ امام بخش صہبائی ص۱۵۶)

تصحیحِ متن کے کام کے لیے واقعی مصنف ہی کی دقتِ نظر درکار ہوتی ہے لیکن کم لوگ ہیں جو کام کا حق ادا کرنے کی کوشش کرتے ہوں اور مبصرانِ باریک بیں کا تو شاید ہر زمانے میں کال رہا ہے۔

صہبائی نے اپنی اِس شرح کو بڑی تقطیع کے ۳۲۷ صفحوں پر ۱۲۶۰ھ مطابق ۱۸۴۴ء میں مکمل کر لیا تھا۔ تاریخ اِس طرح کہی تھی ؎

از بہرِ سالِ او زدہ ہاتف ندا ز غیب
شرحِ سہ کثر خالی از اطناب گفتہ شد

$$۱۲۶۰ = \frac{۱۲۳۳}{۶۳}$$

اِس مصرعِ تاریخ سے بھی اِس شرح کی ایک خصوصیت کا پتا چلتا ہے۔ یہ شرح بھی مقبول ہوئی اور بعد میں مطبعِ نولکشور نے بھی اِسے کئی بار چھاپ کر شایع کیا چنانچہ لکھنؤ سے جولائی ۱۹۰۶ء مطابق جمادی الاول ۱۳۲۴ھ میں یہ تیسری بار چھپی تھی۔

خیال کیا جا سکتا ہے کہ تصنیف و تالیف کی اِس مشین یعنی صہبائی نے اپنے طالبعلموں کے فایدہ کے لیے ایک برس کی مختصر سی مدّت میں فارسی اور اُردو زبانوں میں کئی وقیع علمی کارنامے پیش کر دیے تھے واقعی ؎

ایں سعادت بزورِ بازو نیست تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

۱۲۶۱ھ اور ۱۲۶۲ھ کی لکھی ہوئی صہبائی کی کوئی کتاب فارسی

Marfat.com

زبان میں تا حال ہمارے علم میں نہیں ہے۔ صہبائی کے مزاج اور اُن کی علمی مصروفیتوں کو دیکھتے ہوئے یقین نہیں آتا کہ اُس فنا فی العلم شخص نے دو برس کی مدّت میں کچھ نہ لکھا ہو۔ اُن کا تو یہ حال تھا کہ اگر کبھی تھک کر خود آرام کرنے کا خیال کرتے تھے تو دوست احباب کی فرمائشیں کام کرنے پر مجبور کر دیتی تھیں اور اُن کا قلم جو ہمیشہ جوان ہی رہا تیزیاں دکھانے لگتا تھا۔

شیخ امام بخش صہبائی کو فنِ معمّا سے جو غیر معمولی دلچسپی تھی اُس کا اندازہ اُن کی تصانیف سے بخوبی ہو جاتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اُن کا ذہن ہمیشہ اعمالِ معمّا سے متعلق غور و فکر میں مصروف رہتا تھا۔ ۱۲۶۳ھ مطابق ۱۸۴۷ء میں اُنھوں نے اِس فن سے متعلق ایک اور نہایت قابلِ قدر رسالہ "مخزنِ اسرار" کے نام سے لکھ ڈالا۔ یہ رسالہ اگرچہ صرف چوّن صفحوں پر مشتمل ہے بقامت کہتر و بقیمت بہتر کا مصداق ہے۔ اِسے صہبائی کے "رسالۂ نادرہ" کا تکملہ یا اس کی توسیع سمجھنا چاہیے۔ اِس کے دیباچے میں صہبائی نے لکھا ہے:

"اِس سے قبل چند ورق میری نظر سے گذرے تھے جو ملّا کوکبی نے فنِ معمّا میں ترقیم فرمائے تھے۔ اُن کا تعلق ایک ایسی بیت کی شرح سے تھا جس سے سنیتیس ۳۷ جداگانہ نام اعمالِ معمای کے ذریعے حاصل ہوئے تھے۔ میری خداداد قوّت ایجاد نے نہ مانا کہ میں اِس میدان میں قدم نہ رکھوں۔ چنانچہ میرے خزینۂ خیال سے وہ گوہر برآمد ہوا جسے میں نے گنجینۂ رموز میں درج کیا ہے۔ اُنھیں ایام میں بعض طلبہ کو کبی کی یہی بیت مجھ سے پڑھتے تھے اور اُس سمندر میں غوطہ لگا کر جواہرات نکالتے تھے۔ جب میں نے زیادہ غور کیا تو یہ

Marfat.com

سینکڑوں ناموں کی جلوہ گاہ پایا لہٰذا میں نے یہ جداگانہ
رسالہ تحریر کیا تاکہ نئے ناموں کا طریقِ استخراج اعمالِ
معمّائی کی رو سے بیان کروں"۔ (بحوالہ امام بخش صہبائی ص۱۳۵)

صہبائی کو اپنی "خداداد قوتِ ایجاد" پر اعتماد تھا۔ وہ طالب علموں کو
درس دیتے وقت مسایل پر غور و فکر کرتے رہتے تھے اور اسی کا فایدہ
یہ تھا کہ نئے نئے نکات اُن کے سامنے آتے تھے اور اس طرح علم کا
دایرہ وسیع سے وسیع تر ہوتا رہتا تھا۔ معلّم اگر ہوشمند ہو اور
درس دیتے وقت اپنے ذہن کے دریچوں کو کھلا رکھے اور مسایل
پر توجہ دے تو اُس کی ذات یقینی طور سے علم و دانش کے لیے توسیع
اور برکت کا سبب بنتی ہے لیکن اگر محض رسمی تعلیم دیتا ہے اور صرف
لفظوں سے کھیلتا ہے تو طالبعلموں کی صلاحیتوں کو بھی گھونٹ کر رکھ
دیتا ہے۔ صہبائی بلاشبہ ایک دیانتدار اور صاحب ہوش استاد
تھے۔ اُنھوں نے شاگردوں کی استعداد بڑھای اور خود اپنے قلم
سے علم کے سرمایے میں مسلسل اضافہ کرتے رہے۔

مشہور ہے کہ تصنیف را مصنف نیکو کند بیاں لیکن شیخ
امام بخش صہبائی نے اس کے برخلاف کوکبی کے شرح کو زیادہ بہتر
طور پر مخزن اسرار ثابت کر دیا۔

Marfat.com

کریم الدین کی جسارت

جو لوگ کچھ اس علمی کام کرنے کا حوصلہ رکھتے ہیں اُن کے لیے شیخ امام بخش صہبائی کے حالات میں جیرت اور عبرت کے طرح طرح کے سامان موجود ہیں۔ صہبائی کے ساتھ علمی اعتبار سے کیسی نہایت دردناک واقعے پیش آئے تھے۔ اُن میں سے ایک یہ ہے کہ کریم الدین نامی ایک شخص جو گلدستۂ نازنینان اور تذکرہ طبقات شعرائے اُردو کے مولف کی حیثیت سے مشہور ہے دہلی کالج میں صہبائی کا شاگرد تھا اُس نے صہبائی سے براہِ راست درس لیا تھا اور اُن کی کتابیں بھی پڑھی تھیں۔ اُس شخص کو صہبائی کی کتابوں کی اہمیت کا بخوبی اندازہ تھا اور یہ بھی معلوم تھا کہ وہ علمی حلقوں میں نہایت پسندیدہ اور مقبول تھیں صہبائی کی تمام کتابیں اُس کی دسترس میں تھیں۔ اُن کو دیکھ کر اُس مردِ حریص کو بھی صاحب تصنیف بننے کا شوق ہوا۔ یہ لیں اُس کے پاس موجود تھا۔ صہبائی کی بعض کتابیں اُس کے پریس سے بھی چھپی تھیں۔ اُن کے مسودے بھی اُس کے پاس محفوظ رہے ہونگے اُس نے صہبائی کی کتابوں کی عبارتیں، بعض مطالب کو اُٹھانے کے

Marfat.com

ساتھ (کہ جو شاید اُس نے زبانی درس میں صہبائی ہی سے معلوم کیے تھے) جمع کر کے اُنھیں موضوعات سے متعلق کتابیں تیار کر کے اپنے نام سے شایع کرنی شروع کر دیں۔ اِسی سلسلے کی اُس شخص کی شاید پہلی کتاب "گلدستۂ نازنیناں" تھی جس کے مقدمہ تالیف میں اُس نے ایک خیالی لیکن رنگین حکایت اِس طرح سنائی ہے:

"ایک روز یہ عاجز ایک جگہ شب کو بیچ خدمت ایک دوست کے بنقریبِ ملاقات گیا تھا۔ اُس جا پر ایک محب، بندہ کے بھی ایک کتاب ہاتھ میں لیے ہوئے تشریف لائے۔ میں نے اُن سے وہ کتاب لیکر دیکھی تو ایک بیاض اشعارِ اردو کی (دراصل کی پاسنگ تھی)۔۔۔۔ بندہ نے دو چار شعر اُس بیاض سے پڑھ کر (کذا) کر دریافت کیا کہ رطب و یابس کے بیت سے بھری ہے۔۔۔۔

اس وقت خیال اِس عاجز کے میں یہ گذرا کہ اگر تو۔۔۔۔ سب دیوانوں شعرائے مشتہرہ کو جمع کر کے انتخاب ہر قسم کے اشعار کا کرے اور آخر کتاب میں ایک رسالہ بزبان اردو علم عروض کا مع اشارہ زبان اردو کے لکھ دے تو گویا ایک بیاض عجیب و غریب تیار ہو۔۔۔۔ گلِ نسرین و نسترن دیکھنے میں آوے، دیکھا تو عشق بیچاں پھیلا ہوا ہے۔۔۔۔ بسرعت تمام جس طرح کا انتخاب کہ وہ چاہتا تھا بچشتی دچالاکی چند روز میں تیار کر کے نذر کیا۔" (گلدستۂ نازنیناں، ص ۲)

اس طولانی حکایت کے بعد اُس نے اپنے انتخاب کے زمانۂ ترتیب اور نام وغیرہ کا ذکر اِس طرح کیا ہے:

"جس طرح کے انتخاب کو طبیعت خواہش کرتی تھی اُس طرح پر ماہ ذی الحجہ ۱۲۶۰ ہجری مطابق دسمبر ۱۸۴۴ء عیسوی میں ہوا اور ماہ صفر ۱۲۶۱ ہجری مطابق ۱۸۴۵ء میں چھپنا شروع

Marfat.com

کیا اور نام اُس کا گلدستۂ نازنینان رکھا گیا۔"

کتاب کے خاتمے میں مذکور ہے کہ:

"تمام شد گلدستۂ نازنینان تاریخ بیست و سیوم ماہ رجب المرجب ۱۲۶۱ھ ہجری مطابق بیست و نہم شہر جولائی ۱۸۴۵ء عیسوی کہ تالیفات مولوی کریم الدین صاحب سے۔"

اقتباسات بالا میں جو کچھ کہا گیا ہے اُس کا خلاصہ اس طرح ہو گا:

۱۔ کریم الدین نے ایک کتاب جو بیاض اشعار تھی کسی جگہ دیکھی اُسے خیال ہوا کہ اُسے بھی شعرائے اُردو کے دواوین کا انتخاب کرنا چاہیے۔ اُس نے یہ بھی سوچا کہ اُس کے آخر میں علم عروض کا ایک رسالہ بھی شامل ہو اور اشعار بزبانِ اُردو بھی جمع کیے جائیں۔

۲۔ کسی پُر فضا باغ کی سیر کرتے ہوئے اُس کی طبیعت لہرائی اور اُس نے چند روز میں چستی اور چالاکی سے ایک انتخاب تیار کر لیا۔ اُسی کا نام گلدستۂ نازنینان ہوا۔

۳۔ ذی الحجہ ۱۲۶۰ھ میں گلدستۂ نازنینان مکمل ہوا۔ صفر ۱۲۶۱ھ میں چھپنا شروع ہوا اور رجب کے مہینے میں چھپ کر شایع ہو گیا۔

شعرائے اُردو کے تذکرے فارسی زبان میں دہلی میں کئی لکھے جا چکے تھے لیکن اُردو میں ایسا مجموعہ جسے محض انتخاب دواوین کہا گیا ہو صرف ایک مرتبہ ہو کر چھپا تھا اور وہ صہبائی کا تھا۔ صہبائی کا انتخاب ۱۲۵۲ھ کے وسط میں چھپ کر تیار ہو گیا تھا اور اُس سال کے آخر میں کریم الدین نے گلدستۂ نازنینان مرتب کر ڈالا اور بہت جلد چھاپ کر شایع بھی کر دیا۔

دواوین کا کوئی انتخاب محض "پندرہ روز" میں تیار نہیں کیا جا سکتا بجز اس کے کہ مرتب "چالاکی" سے کام لے۔ اس کی صورت

Marfat.com

یہ ہوئی کہ صہبائی کے انتخاب نے جو کریم الدین کے پاس موجود تھا بنیاد کا کام کیا۔ محض چند شاعروں کے مجمل حالات اور متفرق اشعار کا اضافہ کر دینے سے اُس کی کتاب تیار ہو گئی۔

صہبائی نے جن شاعروں کے حالات لکھے تھے اُن میں کریم الدین نے بعض لفظ، اور فقرے زیادہ کر کے صہبائی کی اصل عبارت کو بھی لے لیا۔ مثال کے طور پر ذوق کے بارے میں صہبائی نے۔ جو کچھ لکھا تھا لفظاً لفظاً گلدستۂ نازنینان میں منقول ہے ذیل میں وہ عبارت درج کی جاتی ہے۔ اس میں جو الفاظ کریم الدین کے ہیں اُن کو قوسین میں لکھ دیا گیا ہے:

"ذوق مخلص (جناب) شیخ محمد ابراہیم دہلوی المخاطب بہ خاقانی ہند زکا ہے۔ یہ شاعر فی زمانہ جو ۱۲۶۱ ہجری ہیں بڑے رتبہ کا جلیل الشان شاعر ہے اور آمد مضامین ہر جستہ کی اس قدر اس کو حاصل ہے کہ کسی شاعر کو آج تک نہیں ہوئی۔ حقا کہ یہ شاعر اُردو گویوں میں اس مرتبہ کا ہے کہ جتنا اُس کی تعریف میں کہیے یا لکھیے سو کم ہے گویا شعر مجسم ہو گیا ہے۔ اکثر اشعار اس شاعر بینظیر کے دیکھنے میں آئے مگر کوئی شعر ایسا نہ دیکھا کہ اُس کا مضمون تازہ اور وہ دلچسپ نہ ہو جیسا کہ اور شعرا کی غزلوں میں ایسا ہوتا ہے کہ دو چار خوب ہیں تو ایک دو بہ نسبت اُن کے اچھے نہیں ہیں اور طرفہ تر یہ کہ جو غزل اُس کی دیکھنے میں آئی کسی کے ساتھ شعر کسی کے پچاسن، کسی کے اٹھائیس۔ اس طرح کا شاعر ہونا بسا مشکل ہے۔ ہم بہت شکر کرتے ہیں خدا کا کہ ہمارے زمانے میں بھی یکتائے فن ہر ایک فن کے موجود ہیں۔ اب اس زمانے میں خصوصاً دہلی میں کوئی ان

Marfat.com

کے مقابلے کا نہیں اور اکثر مشاعروں میں اِس کی آتش زبانی
کے آگے اور شعرا مثل خس وخاشاک کے جلتے ہیں۔
اِس کے الفاظِ برجستہ کے رشک سے جب کہ وہ محفلِ
مشاعرہ میں غزل پڑھتا ہے شرمندہ ہو کر بیتابانہ کفِ
افسوس ملتے ہیں تیس برس کے عرصے سے ملازم (کذا)
درگاہ حالتِ ولیعہدی سے شہنشاہِ حالِ دہلی کے ہیں اور
فنِ شعر میں بھی ابتداے عمر سے مصروف ہیں (مگر حالتِ
صبا سے آج تک یہ عادت طبیعت میں متمکن ہو گئی ہے
کہ جو شعر کہتے ہیں کسی کو نہیں دیتے) لہذا یہ چند اشعار جو
ایک بیاض میں تھے بطریق یادگار لکھے جاتے ہیں۔"

صہبائی نے ۱۲۶۰ھ کے آغاز میں ذوق کی ملازمت کی مدت تیس
برس لکھی تھی۔ کریم الدین نے ایک برس بعد بھی اسی کو نقل کر دیا۔
صہبائی نے ذوق کے اشعار دد "ایک بیاض" سے لیے تھے۔ کریم الدین
نے بھی یہی بات لکھدی۔ کریم الدین نے جو کچھ اضافہ کیا ہے، وہ محض
لفاظی ہے جس کے کوئی خاص معنی نہیں نکلتے۔ صرف ایک بات اُس نے نئی
کہی ہے کہ ذوق اپنے شعر کسی کو نہیں دیتے۔ وہ ذوق کا راز دار اور
دوست نہیں تھا اُس کی یہ بات غلط ہے۔ صہبائی کی تحریروں کے تجزیے
سے یہ بات بخوبی ثابت ہو جاتی ہے کہ ذوق اپنے شعر دے دیتے تھے۔ یہ
بات بھی دیکھنے کی ہے کہ کریم الدین کی عبارت میں جملوں کی ساخت صہبائی کی
عبارت کے مقابلے میں پیچیدہ اور فارسی کا انداز لیے ہوئے ہے۔ اُس کے لفظوں کی
ترتیب میں بھی وہ سلاست نہیں ہے جو صہبائی کی تحریر میں عام ہے۔

صہبائی نے اپنے انتخاب دواوین کے شروع میں اردو شاعری کی
"خاص خاص نظموں" کی تحریروں پر بحث کی تھی۔ اس نے کریم الدین کو
ایک دوسری کتاب کی راہ دکھائی اور وہ کتاب "عجالۃ الاحرار" کے نام سے

Marfat.com

وجود میں آئی۔ بقول کریم الدین اِس کتاب کا:

"مطبع رفاہِ عام واقع حوض قاضی دار السلطنت شاہجہاں آباد
میں اہتمام مولوی کریم الدین صاحب سے ۱۶ تاریخ مئی
۱۸۴۵ء کو چھاپا ہوا"

کریم الدین کے مزاج کا اندازہ اِس بات سے بھی کیا جا سکتا ہے کہ یہ شخص اپنے اہتمام میں خود اپنے نام کے ساتھ "مولوی" اور "صاحب" جیسے کلمے چھاپتا رہا ہے۔ اِس نے عجالۃ العلالہ میں اتنا اعتراف کر لیا ہے کہ:

"یہ رسالہ ترجمۂ حدائق البلاغت ۔۔۔۔ اور چند رسائل
مختلف سے تالیف کیا گیا ہے۔ فقط"

یہ "چند رسائلِ مختلفہ" کا ذکر محض حقیقت کی پردہ پوشی کے لیے ہے۔ یہ بھی صحیح نہیں کہ "ترجمہ حدائق البلاغت" کو ماخذ کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔ صحیح یہ ہے کہ کریم الدین نے گلدستۂ نازنیناں کی طرح عجالۃ العلالہ میں بھی صہبائی کی پوری پوری بحثیں کسی لفظ کی تبدیلی کے بغیر نقل کر لی ہیں دونوں کے عنوان ذیل میں بالمقابل لکھے جاتے ہیں تاکہ بات واضح ہو سکے۔

عنوانات عجالۃ العلالہ	عنوانات ترجمۂ حدائق البلاغت
عجالۂ اول: بیچ بیان بحور میں	خیابان پہلا: بحور اور دوائر کے بیان میں
عجالہ دوسرا۔ بیچ بیان معنی تقطیع اور حروفِ ملفوظہ غیر مکتوبہ اور مکتوبۂ غیر	خیابان دوسرا۔ زحافوں کے بیان میں
	خیابان تیسرا۔ تقطیع کے بیان میں

Marfat.com

عنوانات عجالۃ العلالہ	عنوانات ترجمہ حدایق البلاغت
ملفوظ کے اور بیان اُن حروف کا جو تقطیع میں معتبر ہوتے ہیں	
فصل۔ اب ہم اُن حروف کو بیان کرتے ہیں کہ مکتوب ہوتے ہیں اور ملحوظ نہیں ہوتے۔	
فصل۔ بیان دوایرِ بحور میں	خیابان چوتھا۔ بیچ بیانِ بحور میں
عجالۂ تیسرا۔ بیان اوزانِ رباعی میں	خیابان پانچواں۔ رباعی کے اوزان میں

ترجمہ حدایق البلاغت سے یہ تمام مطالب عجالۃ العلالہ میں خلاصہ کے طور پر لے لیے گئے ہیں لیکن بعض حصص مثلاً زحافوں کا بیان لفظ بہ لفظ نقل ہے۔ اسی طرح ذیل کے اجزا وہ ہیں جو کریم الدین نے اپنے بالہ میں من وعن شامل کر لیے ہیں۔ عنوانوں کی عبارت بھی اُس نے وہی رکھی:

عنوانات عجالۃ العلالہ	عنوانات ترجمہ حدایق البلاغت
خاتمہ۔ بیان قافیہ اور سرقات شعرا میں	حدیقہ چوتھا: قافیہ کے علم میں
فصل پہلی۔ حروفِ قافیہ کے بیان میں	شعبہ پہلا: حروفِ قافیہ کے بیان میں
فصل دوسری: حروفِ قافیہ کی حرکتوں کے بیان میں	شعبہ دوسرا: حروفِ قافیہ کی حرکتوں کے بیان میں
فصل تیسری: ردی کے اوصاف کے بیان میں	شعبہ تیسرا: ردی کے اوصاف کے بیان میں
فصل چوتھی: قافیہ کے عیبوں کے بیان میں	شعبہ چوتھا: قافیہ کے عیبوں کے بیان میں
فصل پانچویں: قافیہ کی تقسیم میں بہ اعتبار وزن کے	شعبہ پانچواں: قافیہ کی تقسیم میں بہ اعتبار وزن کے
فصل چھٹی: ردیف کے بیان میں	شعبہ چھٹا: ردیف کے بیان میں

Marfat.com

عنوان عجالۂ افعلال	عنوانات ترجمۂ حدائق البلاغت
فصل ساتویں: سرقاتِ شعری یعنی شعر کی چوری کے بیان میں	خاتمہ کتاب کا: سرقاتِ شعری یعنی شعر کی چوری کے بیان میں

کریم الدین نے عجالۂ افعلال کے دیباچہ کے لیے صہبائی کے انتخابِ دواوین سے استفادہ کیا ہے۔ شعر کی تعریف میں جو لکھا ہے اُس میں بھی دونوں کتابوں میں کچھ مقام مشترک ہیں۔ کریم الدین کی اِس جسارت بلکہ دیدہ دلیری کی مثال اِس سے پہلے غالباً کوئی نہیں مل سکتی۔ یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ اُس کی یہ کتاب صہبائی کی نظر سے بھی گذری ہو گی اور اِن کو دیکھ کر صہبائی کو جس قدر رنج ہوا ہو گا اُس کا صحیح قیاس کیا جا سکتا ہے۔ صہبائی کے پاس بجز صبر کے کوئی چارہ کبھی تو نہیں تھا۔

۱۸۵۷ء کے غدر میں صہبائی اللہ کو پیارے ہوئے۔ کریم الدین نے زبانِ اردو میں سہ نثرِ ظہوری کی شرح لکھ کر شایع کی۔ نثرِ اول کی شرح "تشہیرِ ظہوری" کے نام سے ایک سو چودہ صفحوں پر چھپی تھی۔ سرورق کی عبارت یہ ہے:

"حسب الحکم کپتان نولز صاحب بہادر ڈائریکٹر آف پبلک انسٹرکشن مدارسِ ممالکِ پنجاب کے، مولوی کریم الدین سررشتہ دار محکمۂ ڈائریکٹری نے طالبعلانِ پنجاب کے واسطے ۱۸۶۱ء میں تصنیف کی اور باہتمام پنڈت اجودھیا پرشاد مہتمم کے مطبع سرکاری میں مطبوع ہوی" (جایزۂ مخطوطات ۱/۱۱۸۲ ف)

نثرِ دوم کی شرح "تکریمِ ظہوری" کے نام سے چھپی تھی۔ اِس کے سرورق پر یہ الفاظ تحریر ہیں۔

"حسب الحکم کپتان نولز صاحب بہادر ڈائریکٹر پبلک انسٹرکشن مدارسِ ممالکِ پنجاب وغیرہ کے، مولوی کریم الدین ڈپٹی انسپکٹر

Marfat.com

مدارس حلقۂ لاہور نے طالب علمانِ پنجاب کے واسطے
۱۸۶۵ء میں تصنیف کی اور بہتمام بابو چندر ناتھ
مترکیولیٹر و مہتمم کے مطبعِ سرکاری میں طبع ہوی۔"
(ایضاً ۱/ص ۱۱۸۳)

نثرِ سوم کے بارے میں نہیں معلوم کہ وہ لکھی گئی تھی یا نہیں۔ بہرحال پہلی دونوں کا مقابلہ صبہائی کی شرحِ سہ نثر سے کیا جائے جو فارسی زبان میں تھی تو کریم الدین کے دعووں کی صداقت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

Marfat.com

آثار الصنادید

شیخ امام بخش صہبائی کے عزیز دوست سرسید احمد خان بہادر نے ۱۲۶۳ھ مطابق ۱۸۴۷ء میں اپنی نہایت مشہور کتاب "آثار الصنادید" کا پہلا ایڈیشن مکمل کیا۔ اس میں انھوں نے صہبائی کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

"کمالاتِ ظاہری اور جلایٔ باطنی اور حسنِ خلق اور اوضاع حمیدہ آپ کے محمود روزگار۔ اس جزوِ زماں میں ایسی جامعیت کے ساتھ کم کوی نظر سے گذرا ہے اور طرفہ یہ ہے کہ فنونِ متعارفہ و سخنوری مثل تحقیقِ لغت و اصطلاحاتِ زبان دری اور تدقیقِ مقاماتِ کتابی اور تکمیلِ عروض و قافیہ و استکمالِ فنِ معما وغیرہا میں ایسا کمال بہم پہنچایا ہے کہ ہر فن میں یک فنی کہنا چاہیے۔ بیت

پذیرفتہ از ہر فنے دوشنی جداگانہ در ہر فنے یک فنی

شرح کتب اور رسایلِ قواعدِ زبانِ فارسی اور رسایلِ علم عروض و قافیہ اور معما آپ کے ریختہ قلمِ تراکت رقم ہیں ایسے نفایس

Marfat.com

مقاصد اور جلائلِ مطالب پر مشتمل ہیں کہ متبعانِ فنونِ مذکور
کو اُن فوائدِ جلیلہ کا حصول بعد ایک عمرِ دراز کے بھی متعسّر
ہے۔ الغرض احاطہ آپ کے محاسن و محامد کا اندازۂ تقریر اور
احاطۂ تحریر سے افزوں ہے۔ اِن کی نظم و نثر کے الفاظ لآلیِ
شاہوار اور معانی یاقوتِ آبدار کی برابری کرتے ہیں۔ قلم کو اِنھیں
کی عبارت انتساخ سے نستعلیق گوی میسر اور صفحہ اِنھیں کے
معنیِ رنگین کے فیض سے باطِ گل کا ہمسر ہر دایرہ طراوت
معنیِ رنگین سے ساغرِ مُل اور ہر سطر رنگینیِ مضامین سے شاخِ گل
اِن کمالات پر حلیم ایسا ہے، خُلق دیا ہے۔ زبان اِن کی ورقِ
نسخۂ اخلاق اور سینہ اِن کا صندوقِ خزائنِ وفاق۔ ہر چند
اِس سرگروہِ اربابِ وفاق اور اِس سرجملۂ نیکوکارانِ آفاق
اور راقم میں سررشتۂ محبت و اخلاص ایسا مستحکم ہے کہ گویا
دو قالب میں ایک جان جاری و ساری ہے اور یہ امر دال ہے
اِس بات پر کہ ذکرِ اوصافِ حمیدہ اِس یگانۂ روزگار کا شاید
نتیجہ افراطِ محبت کا ہو لیکن راقم نے مراتبِ دوستی و مدارجِ اتحاد
کو اِس امر میں کچھ دخل نہیں دیا اور جو کچھ بیانِ واقعی تھا اُسی
کو لکھا وگرنہ محبت کا اقتضا یہ تھا کہ جس وقت اِن کے محامد و
اوصاف میں زبان کھولتا اور تحریرِ مناقب میں قلم ہاتھ میں
لیتا شاید سوالاتِ محشر کے جواب کی تقریب ہی ایک دو
لمحے کے واسطے زبان کو اِس ذکر سے باز رکھتی۔۔۔۔"

(اہلِ دہلی ص ۱۳۸ تا ص ۱۴۰)

کتاب آثارالصنادید کے بارے میں یہ ذکر ضروری ہے کہ اِس کی تکمیل میں
شیخ امام بخش صہبائی نے سرسید کے ساتھ پوری طرح تعاون کیا

Marfat.com

تھا اور اُن کی ہر ممکن مدد بھی کی تھی۔ سرسید کے ساتھ اوایلِ عمر ہی سے صہبائی کو جو موافقت تھی اُس کا ذکر کیا جا چکا ہے۔ وقت کے ساتھ ان روابط میں پختگی پیدا ہوتی چلی گئی یہاں تک کہ جب سرسید نے آثار الصنادید لکھی دونوں ایک جان دو قالب ہو رہے تھے۔ آثار الصنادید کے لیے تحقیق و تلاش کا کام جیسا کہ اوراقِ گذشتہ سے ظاہر ہے صہبائی کے مزاج سے مطابقت بھی رکھتا تھا۔ مختلف ذرایع سے جو متون حاصل ہوئے تھے اُن کی تصحیح بھی صہبائی کی نہایت دلچسپی کا سبب تھی۔ سرسید نے اِس کام کے کرنے کا جب ارادہ کیا ہوگا تو گویا وہ صہبائی کے دل کی بات تھی۔ وہ اِس کام میں اُن کا ہر طرح ساتھ دینے لگے۔ مولانا الطاف حسین حالی نے لکھا ہے:

"سرسید ہمیشہ تعطیلوں میں عمارتِ بیرونِ شہر کی تحقیقات کے لیے شہر کے باہر جاتے تھے۔ اُن کے ساتھ اکثر اُن کے دوست اور ہمدم مولانا امام بخش صہبائی مرحوم ہوتے تھے۔" (حیاتِ جاوید ص۶۳)

یہ بھی مذکور ہے کہ سرسید خود بیان کرتے تھے کہ:

"جس وقت میں چھینکنے میں بیٹھتا تھا تو مولانا صہبائی فرطِ محبت کے سبب گھبراتے اور خوف کے مارے اُن کا رنگ متغیر ہو جاتا تھا۔" (ایضاً ص۶۲)

سچ ہے حسنِ اتفاق کہنا چاہیے کہ دونوں دوست سرکارِ انگریزی ہی کے ملازم تھے دونوں کی تعطیلات ایک ساتھ ہوتی تھیں اور دونوں کو ساتھ ساتھ شہر سے باہر قدیمی عمارتوں کے کھنڈروں کو دیکھنے کے لیے جانے کا موقع مل جاتا تھا۔ گذشتہ اوراق سے یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ صہبائی ہمہ وقت علمی کاموں میں مصروف رہتے تھے بے مقصد سیر یا محض تفریح کے لیے گھومتے پھرنے کے لیے اس نزانی العلم

Marfat.com

شخص کے پاس وقت نہیں تھا۔ سرسید احمد خاں بھی اُن لوگوں میں سے نہیں تھے جو بغیر کسی سبب کے کسی شخص کو اپنے ساتھ لیے ٹہلتے۔ اِس سے تو ان کے کام میں اور ہرج واقع ہوتا۔ صہبائی عمر میں سرسید سے بڑے تھے۔ قدما کی تصانیف کا مطالعہ اِنھوں نے زیادہ کیا تھا۔ قدیم تاریخی واقعات اور شخصیات کے بارے میں یہ نسبتاً بہتر طور سے واقف تھے۔ جدید اور قدیم فارسی کے علاوہ درسی کی اصطلاحات اور الفاظ کی تحقیق میں بھی بقولِ سرسید اِن کو کمال حاصل تھا۔ اپنے رسالہ قواعدِ صرف و نحوِ اُردو میں قدیم ضرب الامثال کی تشریح کر کے صہبائی نے قدیم ہندوی کو سمجھ لینے کی استعداد کا بھی ثبوت پیش کر دیا تھا۔ غرض اپنی گوناگوں صلاحیتوں اور لیاقتوں کی وجہ سے دہلی کی پُرانی تاریخی عمارتوں کی نشاندہی کرنے اور کتبوں کی عبارتوں کے صحیح طور سے پڑھنے اور سمجھ لینے میں اُس وقت اِن سے بہتر کوی شخص نہیں معلوم ہوتا تھا۔ سرسید کے انتخاب کی داد دی جانی چاہیے اور اِسے اُن کی اور خود آثار الصنادید کی خوش بختی سمجھنا چاہیے کہ اِس کام میں صہبائی نے تعاون کیا۔ اِس تعاون سے سرسید کو جو فواید حاصل ہوے اب اُن کا قیاس کرنا بھی آسان نہیں۔ وہ فواید آثار الصنادید کے بعد سرسید کی دوسری علمی اور تحقیقی تصانیف تک بھی بالواسطہ طور سے پہنچے تھے۔ بغیر کسی غرض یا صلہ کے لالچ کے اپنا وقت صرف کرنا اور اپنا دماغ کھپانا غیر معمولی بات ہے۔ اِس سے علمی معاملوں میں صہبائی کے خلوص کا ثبوت ملتا ہے۔

مواد کی فراہمی کے بعد اُس کی تصحیح و ترتیب کا مرحلہ آتا ہے۔ شیخ امام بخش صہبائی شرحِ سہ نثرِ ظہوری وغیرہ کتابوں میں تصحیحِ متن کا کام [illegible]

کا ساتھ دیا۔ صہبائی کے اِس غیر معمولی خلوص اور تعاون نے بعض لوگوں کو اِس غلط فہمی میں مبتلا کر دیا کہ کتاب آثار الصنادید کے بعض حصص سرسید کے نہیں، بلکہ صہبائی ہی کے لکھے ہوئے ہیں۔ اِس غلط خیال کی بنیاد مولانا شبلی نعمانی کے درج ذیل بیان سے پڑی ہے کہ:

"سرسید نے مجھ سے خود بیان کیا کہ آثار الصنادید کے بعض مقامات بالکل مولانا امام بخش صہبائی کے لکھے ہوئے ہیں جو اُنھوں نے میری طرف سے اور میرے نام سے لکھ دیے ہیں"

(مقالاتِ شبلی ۲/ص۵۸)

یہ بات کچھ ڈھکی چھپی نہیں ہے کہ مولانا شبلی سرسید سے رنجیدہ ہو کر الگ ہو گئے تھے۔ مذکورہ جملے مولانا نے اُس لکچر میں کہے تھے جو سرسید کی وفات پر منعقد ہونے والے تعزیتی جلسے میں اُنھوں نے دیا تھا۔ اُس لکچر میں کئی جملے اور بھی ایسے ہیں جو بظاہر تعریفی ہیں لیکن غور کریں تو اُن میں سرسید کی صاف تنقیص کی گئی ہے۔ مولانا کا یہ بیان بھی اِسی نوعیت کا ہے ورنہ یہ بات غور طلب ہے کہ آثار الصنادید کے پہلے ایڈیشن کی تکمیل کے بعد دس برس سے بھی زاید مدت تک صہبائی زندہ رہے تھے۔ اُن کی زندگی میں ہی سرسید نے کتاب کا دوسرا ایڈیشن تیار کیا گویا کتاب کو نئے سرے سے کھڑا کیا تھا۔ دونوں ایڈیشنوں کے بارے میں مختلف معاصرین کی آرا موجود ہیں۔ کسی نے بھی (بہ شمولِ شبلی) پہلے یا دوسرے ایڈیشن کے کسی جزو یا مقام کے بارے میں نہیں کہا کہ یہ سرسید کے سوا کسی شخص کے قلم کا لکھا ہوا ہے۔ دوسرے ایڈیشن کی تیاری کا جو سبب بتایا گیا ہے، مختصراً اِس طرح ہے:

"اِس کتاب کا پہلا ایڈیشن مسٹر رابرٹس کے واسطے سے پہنچا۔ وہاں مسٹر رابرٹس سے انگریزی میں

Marfat.com

ترجمہ کر دینے کی فرمایش کی گئی۔ یہ کام اُنھوں نے مصنف کی مدد سے کیا۔ اُسی وقت یہ خیال ہوا کہ کتاب کو بعض اضافوں اور کچھ ضروری تصحیحات کے ساتھ از سرِ نو مکمل کیا جانا چاہیے۔ (آثار الصنادید، طبع سوم، دیباچۂ انگریزی ص۲)

اِس اقتباس میں ایسا کوئی اشارہ نہیں ہے کہ پہلے ایڈیشن کی عبارت یا طرزِ تحریر کی خرابی کو محسوس کر کے نظرِ ثانی کا کام شروع کیا گیا تھا۔ دوسرے ایڈیشن کی اشاعت کے بعد بھی سرسید کی برس تک یہ تصحیحات رہے۔ اس مدت میں بھی (شبلی اور حالی سمیت) کسی بھی شخص نے نہ تو پہلے ایڈیشن کے طرزِ تحریر میں کسی خرابی کی نشاندہی کی اور نہ دونوں ایڈیشنوں کے کسی فقرے کو بھی بقلمِ غیر بتایا۔ یہ نہایت افسوسناک حقیقت ہے کہ ہم بائی اور سرسید کے پُرخلوص روابط کی داد دینے کے بجائے، سرسید کے نام برآوردہ مدّاحوں نے اُن کی آنکھ بند ہوتے ہی ایسے افسانے تراشنے شروع کر دیے کہ جن سے ایک کی بے لباقتی اور دوسرے کی خرد کا ناپسندیدہ ہونا ثابت ہو جائے۔ مولانا الطاف حسین حالی نے لکھا ہے:

"آثار الصنادید کا سب سے پہلا ایڈیشن جس کی عبارت میں بہت کچھ ساختگی اور تکلف پایا جاتا ہے وہ جیسا کہ سرسید خود اقرار کرتے ہیں مولانا صہبائی کا لکھا ہوا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ------ اُنھوں (سرسید) نے اِس بات کو گوارا نہ کیا کہ جن عمارتوں کی تحقیقات نہایت بامذاقی سے انجام کو پہنچائی ہے اُن کا حال اپنی سیدھی سادی عبارت میں جو اُس وقت خود اُن کی نظر میں مناسب وزن معلوم ہوتی تھی تحریر کریں۔" (حیاتِ جاوید، ص۶۵۳)

اِس اقتباس میں درجِ ذیل امور پر توجہ کی ضرورت ہے:

Marfat.com

۱۔ سرسید کی قدیم طرزِ تحریر سے بحث تو اس مقالے کی حدود سے خارج ہے لیکن صہبائی کی اردو کی تین کتابوں کا تعارف کرایا جا چکا ہے جو آثار الصنادید سے پہلے لکھی جا چکی تھیں۔ اُن کی نثر ویسی نہیں ہے جیسی اس اقتباس میں حالی نے ظاہر کی ہے۔

۲۔ آثار الصنادید کی معاصر ایک سے زاید مصنفین کی کتابیں موجود ہیں جن کی زبان عسیر الفہم نہیں ہے۔ مثال کے طور پر مولوی محمد صادق کی "تاریخ سلطنت خداداد" صاف ستھری زبان میں ہے۔ سید صاحب راوی عبارت کو اُس زمانے میں خود شہر دہلی میں کم وزن خیال کیا جانا ثابت نہیں ہے۔

۳۔ یہ بات ناقابلِ قبول ہے کہ جو شخص علمی نثر لکھنے پر قادر نہ ہو اور خود تحریر کے بارے میں احساسِ کمتری میں مبتلا ہو وہ آثار الصنادید جیسی کتاب لکھنے کا حوصلہ کر سکتا تھا۔ ایسے بے صلاحیت شخص کو اتنا بڑا حوصلہ کرنا بھی نہیں چاہیے تھا۔

۴۔ حالی کا دعوا یہ نہیں ہے کہ آثار الصنادید کی بابت مذکورہ "اقرار" سرسید نے اُن سے یا اُن کے سامنے کیا تھا۔ اُنھوں نے ایک مبہم سی بات کہی ہے اور یہ نہیں بتایا کہ اقرار کس سے کیا۔ بظاہر اُن کے دعوے کی بنیاد شبلی کے بیان پر ہے اور شبلی نے وہ بات نہیں کہی تھی جو حالی کہہ رہے ہیں۔ شبلی نے جو کچھ کہا ہے اُس سے بس یہی نتیجہ نکل سکتا ہے کہ صہبائی اور سرسید کے مابین ایسی گفتگو ہوئی تھی کہ صہبائی بعض عبارتیں لکھ کر اُن کو دے سکتے تھے اور سید جو اُن کے چھوٹے تھے اُس عطیہ کو قبول کر سکتے تھے۔

ہمارے نزدیک حالی کا یہ بیان نہایت مبالغہ آمیز اور خلافِ حقیقت ہی نہیں ہے بلکہ سرسید اور صہبائی دونوں کے واسطے رسوا کن بھی ہے۔ حقیقت صرف اِس قدر معلوم ہوتی ہے کہ آثار الصنادید کا پہلا ایڈیشن سرسید نے [illegible] تیار کیا تھا۔ طبیعت کے جوش میں آکر

Marfat.com

اپنی کتاب کی عبارت پر بھی بہت محنت کی اور باوجودیکہ اُسی زمانے میں صہبائی وغیرہ آسان اُردو نثر لکھ رہے تھے سرسید نے اپنی تحقیقات کو نہایت عالمانہ، رنگین اور مرصع نثر میں لکھ ڈالا۔ چند سال بعد جب اُنھیں نظرِ ثانی کا موقع ملا تو اُنھوں نے بھی اِس کتاب کو از سرِ نو "بہت آسان اور سادہ نثر میں تحریر کیا۔ صہبائی کی تصانیف ہمارے سامنے ہیں اِس لیے اب اِس بات کو تسلیم نہیں کیا جا سکتا کہ صہبائی مرصع، پر تکلف اُردو نثر لکھتے تھے۔

حالی کے بعد قاضی احمد میاں اختر جوناگڑھی نے آثار الصنادید کے پہلے ایڈیشن کے صرف چوتھے باب کو تذکرۂ اہلِ دہلی کے نام سے مرتب کر کے شایع کیا تو اُنھوں نے ایک اور ہی بات پیش کی فرماتے ہیں:

"چونکہ پوری کتاب تاریخی مقامات اور قدیم عمارات پر مشتمل ہے اِس لیے اس میں زیادہ عبارت آرائی ممکن نہیں تھی البتہ اس کے چوتھے باب "تذکرۂ دہلی و اہلِ دہلی" میں مولانا صہبائی کے قلم کی گلکاریاں نظر آتی ہیں اور کوئی تعجب نہیں اگر اِس میں اکثر جگہ بیدل اور ظہوری کا رنگ جھلکتا ہے کیونکہ مولانا مرحوم اُن کے دلدادہ تھے اور اُسی طرز میں لکھتے تھے۔"

(اہلِ دہلی ص۳)

بڑی دلچسپ بات ہے حالی نے کہا تھا کہ "عمارتوں کی تحقیقات کو سرسید نے سیدھی سادی عبارت میں لکھنا گوارا نہ کیا۔" اب قاضی صاحب کا ارشاد ہے کہ اُس بیان میں "زیادہ عبارت آرائی ممکن نہیں تھی" اور اُنھوں نے یا تو بہ زورِ کشف والہام یہ معلوم کر لیا یا شاید محض زورِ تخیل سے یہ نئی بات پیدا کر لی کہ سرسید نے کتاب کا چوتھا باب صہبائی سے لکھوا لیا تھا۔ صہبائی کی اولین تحریر "تعریفِ روضۂ منورۂ حضرت جلال صاحب" کو

Marfat.com

دیکھنا چاہیے کہ اس شخص نے نوعمری میں اُس روضہ کے بیان میں کیسی عمدہ عبارت آرائی کی ہے۔ اِس عبارت کو دیکھنے والا اِس دعوے کو تسلیم نہیں کر سکتا کہ عبارتوں کے بیان میں عبارت آرائی نہیں ہو سکتی۔ دوسری بات یہ ہے کہ طرزِ بیدل اور ظہوری ایسا نہیں تھا جس میں صہبائی کے سوا کوئی اور لکھ ہی نہیں سکتا ہو۔ صہبائی کے استاد عبداللہ خاں علوی کی تحریریں بھی اِس سلسلے میں دیکھی جا سکتی ہیں۔ چنانچہ یہ دعوا کہ اِس طرز میں جو بھی تحریر ہے وہ خواہی نخواہی صہبائی ہی کے قلم کی گلکاری ہے محض مفضول ہے۔ اہلِ علم اور صاحبانِ تحقیق کو بے دلیل باتوں اور ریلے سنے دعووں سے ہمیشہ بچنا چاہیے۔

آثار الصنادید کے پہلے ایڈیشن کا چوتھا باب "شاہجہاں آباد کے لوگوں کا بیان" اِن کلمات سے شروع ہوتا ہے:

"اگرچہ لوگ یہ خیال کریں کہ میں نے اِس شہر کے لوگوں کا جو حال لکھا ہے وہ بہ نظرِ حبُّ الوطن ہوگا لیکن جن لوگوں کے مزاج میں انصاف ہوگا وہ میری اِس کتاب کو دیکھ کر جان لینگے کہ میں نے جو حال لکھا ہے وہ افراط و تفریط سے خالی ہے۔ حقیقت میں یہاں کے لوگ ایسے ہیں کہ شاید اور کسی اقلیم کے نہ ہونگے"۔

(اہلِ دہلی ص۱)

دیکھا جا سکتا ہے کہ اِس اقتباس کی عبارت نہ مسجع ہے، نہ مقفیٰ اور نہ پیچ در پیچ خیالوں اور طرزِ بیان میں ہے۔ یہ طرزِ بیدل بھی نہیں ہے۔ یہی اندازِ عبارت اِس پورے باب کا ہے البتہ جہاں اشخاص کا ذکر کرتے ہیں نام ور کے ساتھ مسجع، مقفیٰ القاب و آداب اور تراکیب کا صرف کرتے ہیں چنانچہ "ذکرِ بلبل نوایانِ شاہجہاں آباد" کے تحت "جناب مولانا مولوی امام بخش صہبائی تخلص سلمہٗ اللہ تعالیٰ" کے حالات اِس

Marfat.com

طرح شروع کیے ہیں:

"زمگ زدائے آئینۂ سخنوری، مصقلِ مراتِ معنی پروری، نخلبندِ حدیقۂ کمالاتِ صوری؛ پردہ کشائے حسنِ جلایلِ معنوی، معجزہ طرازِ طرزِ تازہ، بزم افروزِ حمایدِ بے اندازہ، ساقیِ خمکدۂ سخن سرائی، مولوی امام بخش متخلص بہ صہبائی"

اِس بارے میں شبہ نہیں ہونا چاہیے کہ خود کو "فقیرِ بیمدا ل کج مج زباں" کہنے والا صہبائی اپنے لیے یہ کلمات نہیں لکھ سکتا تھا۔ صہبائی کے حالات میں مدرسۂ دہلی کی ملازمت کا ذکر ہے اور نہ صہبائی کی اردو کی کتابوں کی طرف کسی قسم کا اشارہ ہی ہے۔ اگر اِس باب کو صہبائی نے لکھا ہوتا تو وہ اِن کا ذکر ضرور کرتے۔

آثار الصنادید کے پہلے ایڈیشن کے آخر میں تین شخصوں کی لکھی ہوئی تقریظیں شامل ہیں۔ پہلی غالب کی، دوسری صہبائی کی اور تیسری آزردہ کی ہے۔ سرسید بقولِ دا کی "مرزا غالب کو چچا کہتے تھے" (حیات جاوید ص۶۷) اور بقولِ خود صہبائی سے "برادرانہ" رابطہ رکھتے تھے۔ چچا کا درجہ بھائی سے بلند تر ہوتا ہے اِسی لیے سرسید نے غالب کی تقریظ کو اوّلیت دی۔ کتاب کے آخر میں صہبائی کی کہی ہوئی نہایت برمحل، بامعنی تاریخ درج کی ہے:

صنعۃ، سید احمد خاں منصف

۱۲۶۳ ہجری

Marfat.com

اِس صراحت کے بعد بھی یہ کہنا کہ پوری کتاب یا اس کا کوئی باب یا کوئی جزو سر سیّد کا نہیں بلکہ صہبائی کے قلم کا لکھا ہوا ہے محض بے سند ہے اور دونوں بزرگوں کے لیے رُسوا کن بھی۔

Marfat.com

۱۲۶۳ھ/۱۸۴۷ء تک

سرسید احمد خاں نے شیخ امام بخش صہبائی کی تصانیف کا ذکر کرتے ہوئے اُن کی ایک کتاب "انشائے مکاتیب" بھی بتائی ہے۔ لکھتے ہیں:

"ایک انشائے مکاتیب عبارت اور لطافتِ معانی کے ساتھ ہے کہ اکثر اُس کا بیان بطرز مرزا بیدل علیہ الرحمہ ہے۔" (اہلِ دہلی ص ۱۳۹)

اِس مجموعے کا سالِ ترتیب معلوم نہیں شاید ۱۲۶۳ھ مطابق ۱۸۴۷ء میں یا اِس سے پہلے کسی سال میں مرتب ہوا ہو۔ بصورتِ [illegible] یہ کلیاتِ صہبائی میں "بیاضِ شوقِ پیام" کے جزو کی حیثیت سے شامل ہے۔ اِس مجموعے میں چوہتر خط ہیں۔ جن کے بارے میں یہ کہنا مشکل ہے کہ یہ سب وہی ہیں جو انشائے مکاتیب میں اصلاً شامل تھے۔ بعض خط اِس مجموعے میں یقینی طور سے ایسے ہیں جو صہبائی نے بعد میں لکھے تھے۔ خطوں کی تعداد حسب تفصیل ذیل ہے:

Marfat.com

بہ دو سنٹے	۴
بہ علوی	۵
بہ نواب حیدر حسن خاں	۱۲
بہ منشی دین دیال	۱۶
بہ منشی دھرم نارائن	۳
بہ بزرگے	۲۳
بہ مولوی محمد حسین بحر	۶
بہ لالہ بلدیو سنگھ	۵
کل =	۷۴

اسی سال یعنی سنہ ۱۲۶۳ھ میں مولوی کریم الدین نے بھی اپنا تذکرہ طبقات شعرائے اردو شایع کیا۔ اس تذکرے میں اُس نے صہبائی کے حالات کسی قدر تفصیل سے لکھے ہیں:

"مولوی امام بخش صہبائی، ساکنِ شاہجہاں آباد، چیلوں کے کوچے میں رہتے ہیں۔ حلیہ اِن کا یہ ہے۔ قد میانہ، تمام سر پر بال، گندم گوں کھلا ہوا رنگ، دبلے پتلے، منہ پر چیچک کے بھی داغ کہیں کہیں ہیں شعرِ عجم فارسی میں بڑا دستِ قدرت رکھتے ہیں۔ ہمارے زمانے میں کتبِ فارسی سے مثل اِن کے کوئی ماہر نہیں۔ ظرافت پسند، علم دوست، رات دن طلبا کو پڑھانے میں رہتے ہیں۔ تمام کتبِ فارسی پر عبور ہے۔ کتبِ عربیہ میں سے صرف و نحو اور معانی و منطق بھی جانتے ہیں مگر بحرِ فارسی کے اُردو شعر نہیں کہے۔

عمر اِن کی بالفعل اِس سال یعنی سنہ ۱۲۶۱ھ مطابق سنہ ۱۸۴۵ء میں قریب ۴۰ برس کے ہوگی اور شرحِ الفاظ مشکلہ ٹیک چند بہار بھی اِن کی تالیف سے درمیان اس سال یعنی ۱۸۴۷ء کے

Marfat.com

چھپی ہے اور ایک رسالہ معمہ کے حل میں انھوں نے بہت خوب تصنیف کیا ہے۔ اُس میں ایک شعر سے سات سو نام نکلتے ہیں..... یہ صاحب بسکہ فارسی شعر کے اُردو شعر نہیں کہتے مگر چند شعر ان کی تصنیف حدائق البلاغت کے ترجمہ میں اردو ہیں۔"

اِس اقتباس میں صہبائی کے بارے میں جو اطلاعات دی گئی ہیں اُن کی تفصیل اس طرح ہے:

۱۔ صہبائی کا رنگ کھلا ہوا گندم گوں تھا اسی لیے اپنی مثنوی دمغ الباطل میں منشی میر محمد عباس شوستری سے خطاب کرکے وہ یہ کہہ سکے کہ

ایں سیاہت بناہ خواہد کرد　　وآں چو دیت سیاہ خواہد کرد

جو شخص خود کالا ہو یا جس کے بہت قریبی اعزا بھائی اور بیٹے سیاہ فام ہوں وہ کسی سے یہ بات نہیں کہہ سکتا تھا۔

۲۔ یہ چیچک کے داغ اِس حقیقت کے غماز ہیں کہ ابتدائی عمر میں صہبائی کے چیچک نکلی تھی اِس سے اِن کے چہرے کی رنگت بھی متاثر ہوئی ہوگی ورنہ وہ شاید گورے رہے ہونگے۔

۳۔ چیچک کی بیماری اور پھر "رات دن" کی مصروفیت نے صحت پر بُرا اثر ڈالا تھا چنانچہ وہ "دُبلے پتلے" تھے۔ گارساں دتاسی نے دسمبر ۱۸۵۵ء کے اپنے خطبے میں بیان کیا ہے کہ:

"اِن کی ڈاڑھی سرخ رنگی ہوتی تھی۔ (خطبات ۱۸۹)

یہ اِس بات کی دلیل ہے کہ ڈاڑھی کے بال سفید ہو گئے تھے۔ یہ بھی کمزوری اور جسم کی صحیح طور سے پرداخت نہ ہونے کے سبب تھا:

۴۔ صہبائی کی جن دو کتابوں کا اس اقتباس میں ذکر آیا ہے وہ دونوں ان کے کلیات میں شامل نہیں ہیں اِن میں سے "شرح الفاظ مشکلہ" کا ذکر

Marfat.com

کیا جا چکا ہے۔ دوسرا رسالہ معمہ سے متعلق ہے جس کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ اس میں ایک شعر سے "سات سو نام" نکلتے ہیں۔

صہبائی نے ۱۲۶۳ھ مطابق ۱۸۴۷ء میں ہی اپنا رسالہ "مخزنِ اسرار" مکمل کیا تھا جس میں انھوں نے کوکبی کے ایک شعر سے ڈیڑھ سو کے قریب ناموں کا استخراج کیا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے غور و فکر کے سلسلے کو جاری رکھا اور اسی سال میں وہ رسالہ بھی لکھ ڈالا جس کا اقتباس بالا میں مذکور ہے۔ ڈاکٹر خواجہ محمد حامد نے لکھا ہے کہ:

"اس کا نام درج نہیں ہے۔ کلیات میں موجود نہیں۔ راقم السطور نے مصنفاتِ صہبائی میں اسے معمّائے ہفتصد نام کے عنوان سے درج کیا ہے۔" (امام بخش صہبائی ص ۱۱)

۵۔ یہ تسلیم کرنے کے باوجود کہ صہبائی کے کچھ اردو شعر حدائق البلاغت کے ترجمے میں شامل ہیں۔ کریم الدین کا یہ دعوا کہ "بجز فارسی کے اردو شعر نہیں کہے" اور اس بات کو مکرر کہنا بہت عجیب ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ صہبائی نہایت باصلاحیت شخص تھے۔ فنونِ شعر گوئی پر انھیں قدرت حاصل تھی زبانِ اردو پر ان کے قادر ہونے کی شہادت ان کی تصانیف پیش کرتی ہیں چنانچہ اس بارے میں شبہ کی کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ وہ اردو میں بھی شعر کہہ سکتے تھے اور بہ گمانِ غالب انھوں نے بہ ضرورت اردو میں خود شعر کہہ کر ترجمۂ حدائق البلاغت میں مثالوں کی جگہ پیش کیے ہیں۔ کریم الدین اور اس کے بعد مرزا قادر بخش صابر نے بھی ان کے ایسے شعروں کی نشاندہی نہیں کی ہے۔ یہ کام سب سے پہلے غالباً حکیم نجم الغنی خاں نے اپنی کتاب بحر الفصاحت میں کیا لیکن انھوں نے یہ نہیں بتایا کہ کسی شعر کردہ کن شہادتوں کی بناء پر صہبائی سے منسوب کر رہے ہیں جو شعروں کو حکیم نجم الغنی خاں نے صہبائی کا بتایا ہے ان سے متعلق بحر الفصاحت اور ترجمہ حدائق البلاغت کی عبارتیں درج کی جاتی ہیں۔

Marfat.com

از بحر الفصاحت

مولوی صہبائی ؎

دیکھنا منہ لال ہو جائینگے کس کس کے ابھی
سامنے میرے جو برگِ سبز پان تو نے دیا

یعنی منہ کا سرخ ہونا بہ سبب پان کے اور دوسرے بعید یعنی منہ کا لال ہونا طپانچوں سے اور ایہام اسی کو کہتے ہیں کہ سامع کا خیال معنی قریب کی طرف جاوے اور قایل کی مراد معنی بعید ہوں۔

(ص ۹۲۷)

یہ شعر مولوی صہبائی کا ہے ؎

شب کو جشنِ سرورِ تخت رہا
کارِ فیضِ مدارِ بخت رہا

ص ۹۰۰

"صہبائی ؎

زلف اُس مہوش کے رُخ پر اک دخان ہے آگ پر
اور رخ اُس مہروش کا شعلۂ زیرِ دخان
ہائے یوں ہو اُس دخان سے تیرہ اپنا روزِ عیش
اور اس شعلے سے یوں روشن ہو شامِ دشمناں

مقصود بالتمثیل اس قطعہ میں مذکور ہونا دخان اور شعلے کا اور پھر مذکور ہونا تیرہ ہونے روزِ عیش کا دخان سے اور

از ترجمہ حدائق البلاغت

"مثال اس تدبیر کی کہ بطریق ایہام کے مقصود حاصل ہو یہ ہے ؎

دیکھنا منہ ـــ الخ

یعنی سرخ ہونا منہ کا بہ سبب پان کے اور دوسرے بعید معنی منہ کا لال ہونا طمانچہ سے اور یہی مراد ہے۔"

(ص ۹۲۸)

"ضمیفادہ ہے کہ سارا ایک کلمہ منقوطہ اور ایک کلمہ غیر منقوطہ ہو اور لزوم مالایلزم کی قبیل سے ہے

شب کو جشن ـــ الخ"

"صنعت تقسیم کی مثال ؎

زلف اُس مہوش ـــ الخ

مقصود بالتمثیل اس قطعہ میں مذکور ہونا دخان اور آتش کا اور پھر مذکور ہونا تیرہ ہونے روزِ عیش کا دخان سے اور روشن ہونا شامِ دشمناں کا شعلے سے ہے اور ذکر زلف اور رخ اور مہ اور مہر اور دخان اور شعلہ اور تیرہ اور روشن ہو دو چیزوں کا مراعاۃ النظیر کی

Marfat.com

روشن ہونا شام دشمناں کا شعلہ سے
ہے"۔ (ص ۹۶۵)

"صہبائی سے
تجھ اور تیرے دشمن کو سوا ہے اوج عالم میں
تجھے تخت خلافت پر اُسے دار سیاست پر
(ص ۹۷۳)

"مولوی صہبائی سے
کہتا ہے کہ اب نہ کھینچ تو آہیں
ہیں دل سے تیرے تو ہم تلک راہیں
تقطیع:
کہتا ہ مفعول، کِ اب نَ کے مفاعلن
چ تو آ ہیں مفاعیلن"
(ص ۱۶۵)

"اس شعر میں مولوی صہبائی کے
بیٹھا وہ رقیب کے جو پہلو میں
اٹھایہ دردِ دل کہ کھینچی آہ"
(ص ۱۶۶)

"صہبائی سے
آتشِ غم ایسی کچھ بھڑکی کہ پل میں ہو گیا
داغِ دل سے آفتابِ روزِ محشر آشکار
(ص ۹۴۹)

قبیل سے ہے۔ سو یہ دونوں صنعتیں
پہلے مذکور ہو چکی ہیں" (ص ۷۵)

"صنعت جمع و تقسیم، صنعت جمع اور
صنعت تقسیم کے اکٹھا کرنے کو کہتے ہیں جیسے
اس شعر میں سے تجھ اور تیرے ۔۔۔ الخ
مصرعِ اول میں صنعت جمع اور دوسرے
میں صنعتِ تقسیم ہے" (ص ۷۶)

"بحرِ مجتث مسدس اخرب مقبوض اشتر
مستفع سے
کہتا ہے کہ ۔۔۔ الخ
تقطیع: کہتا ہے مفعول، کِ اب نَ کے مفاعلن
چ تو آ ہیں مفاعیلن، ہیں دل
سے مفعول، ترے تو ہم مفاعلن، تلک راہیں
مفاعیلن" (ص ۱۲۹)

"اس شعر میں سے بیٹھا وہ رقیب الخ
تقطیع: بیٹھا وہ مفعول، رقیب کے مفاعلن
جو پہلو میں مفاعیلن۔
اٹھایہ مفعولن، دردِ دل کا فاعلن
کہ کھینچی آہ مفاعیلان" (ص ۱۲۹)

"اس (تجرید کی) مثالیں عربی اور فارسی
میں بہت ہیں۔ اردو میں یہ شعر مثال ہو سکتا
ہے سے آتشِ غم ایسی ۔۔۔ الخ (ص ۱۲)

Marfat.com

"تو اے صہبائی ؎
مجھے دیکھ کر تیغ کو دیکھتے ہیں
غرض یہ کہ ہو خون ناحق کسی کا"
(ص ۹۵۳)

"مجھے دیکھ کر ـــ الخ
یعنی غرض یہ کہ خون ناحق میرا ہو۔ حاصل
یہ ہے کہ اپنے تئیں ناحق کشتہ ہونے کی صنعت
میں ایسا کامل قرار دیا کہ اپنے سے اور شخص
حاصل کیا" (ص ۷۷)

ترجمہ حدائق البلاغت میں ان میں سے ایک شعر سے متعلق بھی ایسا کوئی واضح اشارہ موجود نہیں ہے جو ان کو گفتۂ صہبائی ظاہر کرتا ہو، البتہ ساتویں شعر میں مثال فراہم کرنے کی ضرورت کا اظہار موجود ہے۔ حکیم نجم الغنی خاں کے سوا کسی نے ان شعروں کو صہبائی سے منسوب نہیں کیا ہے باوجود اس کے جب تک کوئی شہادت برخلاف دستیاب نہ ہو جائے حکیم صاحب کے انتساب کی صحت کو تسلیم کرنے کے سوا چارہ نہیں ہے۔

ترجمہ حدائق البلاغت میں صہبائی نے مثالوں میں مختلف شعرا کے اشعار پیش کیے ہیں لیکن چند مثالیں ایسی ہیں جن کے بارے میں خیال ہوتا ہے وہ سب خود صہبائی ہی کی طبعزاد ہیں مثلاً:

"حدائق البلاغت کے مصنف نے اگرچہ بحر قریب اور جدید اور مشاکل کو مذکور نہیں کیا لیکن مترجم کو مناسب معلوم ہوتا ہے کہ طالبین کے فایدے کے واسطے ان کو بھی یہاں لکھے ..... بحر قریب مکفوف مفاعیل مفاعیل فاعلاتن۔ مثال ؎

غبار آکے ترے دل میں پھر نہ نکلا — غبار ہم کو تری طرف سے پھر نہ آیا

..... بحر جدید مخبون : فعلاتن فعلاتن مفاعلن۔ مثال ؎

ترے قد سے ہے صنوبر اب خجل — تیری زلفوں سے ہمیشہ ہے شب خجل

.... بحر مشاکل مکفوف مقصور : فاعلات مفاعیل مفاعیل۔ مثال ؎

بار غم کا اٹھانا ہی پڑا آہ — داغ ہجر کو کھانا ہی پڑا آہ (ص ۱۴۰ تا ص ۱۴۱)

Marfat.com

اور:

"مفاعلن مفتعلن مفاعلن مفتعلن۔ اِس وزن میں اشعارِ اردو دیکھے نہیں گئے۔ بہرحال مثال اِس کی یہ ہے ؎

دل و جگر خون ہے مرا، سر شک خون بستے سدا" (ف ۱۳)

جس وزن میں اشعارِ اردو دیکھے نہیں گئے اُس میں خود کہہ کر صہبائی نے مثال پیش کر دی۔ تلاش کریں تو ایسے بعض شعر اور بھی صہبائی کی کتابوں میں مل سکتے ہیں:

اوپر صہبائی سے منسوب اردو کے جو اشعار نقل کیے ہیں غور کریں تو اُن میں ایک قطعہ کے علاوہ بیشتر غزل کے شعر ہیں۔ ایک دو شعر قصیدے کے اور مثنوی کے بھی معلوم ہوتے ہیں۔ ان شعروں کی روشنی میں غالباً یہ کہنا درست ہوگا کہ صہبائی نے اردو شاعری کی مروّجہ مختلف اصناف میں شعر کہے تھے البتہ یہ متعین نہیں کہ اُنھوں نے کوئی پورا قصیدہ یا مکمل مثنوی بھی نظم کی تھی یا نہیں۔

Marfat.com

تلامذہ

مولوی کریم الدین کے تذکرے میں شیخ امام بخش صہبائی کے بعض شاگردوں کا حال بھی مندرج ہے۔ اُن میں سے کچھ کا ذکر مختصراً کیا جاتا ہے:

۱۔ نثار علی نثار۔ اِن کے بارے میں سر سید احمد خاں نے مفید اطلاعات فراہم کی ہیں لکھا ہے:

"میر نثار علی نثار ابن مولوی عبداللہ ..... مولوی رحمت اللہ کہ اِن کے جدِّ اعلا تھے استاد تھے محمد شاہ بادشاہ کے اور ان کے پرنانا مولوی اشرف صاحب استاد عالمگیر کے تھے انھوں نے تحصیل کتب فارسی اور مشق سخن مولوی امام بخش صہبائی سے کی ہے" (اہل دہلی ص۱۴۸)

مولوی کریم الدین نے اِس پر کسی قدر اضافہ کیا ہے اُن کا کہنا ہے کہ:

"شاہجہاں آباد میں رہتا ہے۔ اس جائے مولوی امام بخش اور مولوی عبداللہ سے فارسی تحصیل کی۔ معلّم گری کرتا ہے سوائے ازیں کچھ اِس کو شاید قلعہ میں بھی علاقہ ہے مگر اکثر کوچہ و بازار میں مجھ سے ملاقات اِس کی ہوتی ہے" (طبقات شعرا)

Marfat.com

مولوی عبداللہ سے یہاں عبداللہ خاں علوی مراد ہو سکتے ہیں، جو صہبائی کے استاد تھے ہو سکتا ہے کہ صہبائی کے واسطے سے نثار نے کچھ مختصر سے وقفہ میں علوی سے کسبِ فیض کیا ہو۔ نثار اپنے وقت کے قابلِ قدر خطاطوں میں سے تھے چنانچہ بہادر شاہ ظفر کا دوسرا دیوان جو ۱۲۷۳ھ جلوس مطابق ۱۸۵۶ء میں مطبع سلطانی واقع قلعہ معلّا میں چھپا تھا نثار کے ہاتھ کا لکھا ہوا تھا۔ حافظ محمود خاں شیرانی کے کتبخانے میں اِس کا ایک نسخہ موجود تھا۔ تخلص بتاتا ہے کہ نثار شعر کہتے تھے لیکن اردو میں اِن کے شعر کہنے کا ثبوت نہیں مل سکا ہے۔

۲۔ محمد حسین بحر انصاری: ضلع بلند شہر میں قصبہ جیور کے قاضی زادوں میں سے تھے۔ غدر کے بعد اندور میں ناظم عدالتِ دیوانی کے عہدے پر فایز ہو گیے تھے۔ سر سید نے اِن کے بارے میں لکھا ہے:

"مولوی محمد حسین بحر شاگرد رشید مولوی امام بخش صہبائی تمام کتب منثور و منظوم فارسی انھیں کی خدمت میں تحصیل کیں اور مشقِ سخنوری بھی اُنھیں کے التفات سے بہم پہنچائی۔ تحقیق مقامات اور تدقیقِ رموزِ مکتبۂ کتب متداولہ خوب طرح سے کی ہے لغت و اصطلاحِ فارسی پر نظر اور زبان دری کا تتبع بہ کمال ہے۔ انشائے نظم و نثر میں دستگاہ کامل رکھتے ہیں۔" (اہل دہلی ص۱۴۳)

بحر نے اپنے استاد کے رسالہ "قولِ فیصل" کی اشاعتِ اول کے لیے فارسی میں منظوم تقریظ لکھی تھی جس سے اُن کی لیاقتوں کا کسی قدر اندازہ ہوتا ہے۔

۳۔ پنڈت دھرم نارائن۔ صہبائی کے عزیز ترین شاگردوں میں سے تھے۔ کریم الدین نے لکھا ہے کہ:

"پنڈت دھرم نرائن ابنِ لبشن نرائن، بہت خلیق اور

Marfat.com

باادب اور عقلمند اور ہوشیار اور چالاک اور تیز ذہن آدمی ہے۔ اس نے کئی کتابوں کا ترجمہ کیا ہے۔ درمیان ۱۸۴۷ء کے عمر اس کی قریب بائیس تیئیس برس کے ہے۔" (طبقات شعرا)

ان کا ذکر حافظ محمود خاں شیرانی نے بہت ستائش کے انداز سے کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

"صہبائی ادیب و شاعر ہونے کے علاوہ صاحب تصنیفات کثیرہ ہیں۔ دہلی کالج میں صدر مدرس فارسی تھے۔ ... صہبائی کا قول فیصل اُن کے شاگرد پنڈت دھرم نارائن میر منشی عبقی مالوہ ۱۲۷۸ھ میں مطبع نظامی کانپور سے شایع کرتے ہیں۔"

(مقالاتِ شیرانی ۳/۱۸۷)

قولِ فیصل کی اِس اشاعت کے لیے خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے حافظ صاحب نے لکھا ہے:

"آفریں ہے پنڈت جی کی! استاد پرستی پر کہ سرکاری پولٹیکل خدمت پر سرفراز ہونے کے باوجود غدر سے پانچ سال بعد مرحوم (صہبائی) کے فرزندانِ معنوی کو زندۂ جاوید بنانے کی کوشش میں مصروف ہیں۔" (مقالاتِ شیرانی ۲/۳۳۳)

اِس "آفریں" میں نکتہ یہ ہے کہ چونکہ صہبائی اور ان کے بیٹے بھتیجے وغیرہ غدر میں انگریزوں کے ہاتھوں شہید ہوئے تھے، غدر کے بعد [illegible] جب اُن کا اقتدار مستحکم ہو گیا تو خود دہلی میں بعض ایسے لوگوں نے جن کو انگریزوں کا قرب حاصل تھا اور جو مرزا کے خواہاں تھے شعوری اور غیر شعوری طور پر ایسی باتیں کہیں اور لکھیں جن میں صہبائی کی علمی حیثیت کی تحقیر کی گئی تھی۔ آثار الصنادید کے قضیہ سے قطع نظر بعض اور واقعات آگے بیان ہوں گے۔

Marfat.com

۴۔ پنڈت دھرم نارائن کے چھوٹے بھائی پنڈت سروپ نارائن بھی غالباً صہبائی ہی کے شاگرد تھے۔ قولِ فیصل کی منظوم تقریظ میں مولوی محمد حسین بحر نے ان کا نام بھی لیا ہے۔

۵۔ پنڈت رتے (جودھیا پرشاد: مبتلا تخلص کرتے تھے اردو کے صاحب دیوان شاعر تھے ان کا قلمی دیوان جو ۱۸۹۵ء کا لکھا ہوا ہے بنارس ہندو یونیورسٹی کے کتبخانے میں موجود ہے۔ مولوی کریم الدین نے ان کے بارے میں لکھا ہے:

"اجودھیا پرشاد قوم سے کشمیری، رہنے والے دہلی کے، مردِ متین اور ذہین اور عقلمند اور محنتی ہیں۔" (طبقات شعرا)

پنڈت دھرم نارائن کو صہبائی کے ہاتھ کا لکھا ہوا رسالہ قولِ فیصل انھیں کے یہاں دستیاب ہوا تھا۔ چنانچہ اس کا اعتراف کرتے ہوئے انھوں نے بیان کیا ہے:

"... تا در ریاست با مولنس جان و ہمدم روح روان قافیہ پیمائے سخن آشنا پنڈت اجودھیا پرشاد مبتلا، آرزوے دیرینہ خود دست برد یعنی اصل مسودۂ آں کتاب (قولِ فیصل) لطف انصاب از دستِ مغری الیہ بدست آوردہ۔"

(قول فیصل ص ۱۶۹)

۶۔ شاہزادہ مرزا پیارے رفعت کا حال اگرچہ مولوی کریم الدین کے تذکرہ میں درج ہے لیکن ان کے صہبائی سے تلمذ کی طرف کوئی اشارہ نہیں ہے۔ لالہ سیتا رام نے ان کے بارے میں لکھا ہے:

"۱۲۴۱ھ میں پیدا ہوئے اوایل عمر میں حافظ عبدالرحمٰن احسان سے اصلاح لی تھی۔ بعد میں حضرت صہبائی سے تلمذ اختیار کیا۔... صاحب دیوان تھے۔ غدر کے بعد انور سے جو شاہزادے

Marfat.com

گرفتار ہو کر آئے اُن میں یہ بھی تھے۔ نشانۂ تفنگِ اجل ہوئے"۔
(خمخانہ ۳/۴۷۸)

۷۔ دیوانِ ذوق میں مولانا محمد حسین آزاد نے حاشیہ پر ایک جگہ لکھا ہے کہ:

"مرزا شاہرخ بادشاہ کے ایک بیٹے ولیعہد سے چھوٹے تھے۔ وہ مولوی امام بخش مقتول کے شاگرد تھے۔ اُن سے فارسی پڑھا کرتے تھے"۔ (دیوانِ ذوق حاشیہ ص۲۵۱)

یہی بات آزاد کے شاگرد ناصر نذیر فراق نے اس طرح لکھی ہے:

"مرزا شاہرخ حضرت ابوظفر بہادر شاہ کے اکلوتے فرزند ولیعہد تھے۔ مولوی امام بخش صہبائی کو اتالیقی کی خدمت سپرد تھی"۔ (دہلی کا اُجڑا ہوا لال قلعہ ص۹)

۸۔ صہبائی کی "انشائے مکاتیب" میں بھی اُن کے چند شاگردوں کے نام نظر شامل ہیں۔ اُن میں منشی دین دیال کو یہ خصوصیت ہے کہ سب نیاز نامے خط اُن کے نام ہیں۔ حافظ محمود خاں شیرانی نے اُن کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

"ان (صہبائی) کا کلیات ایک اور شاگرد منشی دین دیال میر منشی ایجنسی بھوپال ۱۲۹۶ھ مطابق ۱۸۷۹ء میں مطبع نظامی سے تین ضخیم جلدوں میں چھپوائے ہیں"۔ (متوالات ص۱۳۵)

منشی دین دیال اپنے استاد کو کتنا عزیز تھے اس کا اندازہ اس واقعے سے کیا جانا چاہیے کہ ایک مرتبہ انھوں نے استاد کی خدمت میں ایک مخملی ٹوپی بھیجی۔ شاگرد سے یہ تحفہ پا کر استاد بہت خوش ہوئے۔ انھوں نے اس ٹوپی کو تاج کے رتبے میں خیال کیا اور یہ شعر لکھا:

در سلامِ مخمل افسرِ آرزومنداں بجا آورد نہ مانند

Marfat.com

بیدماغانِ گوشۂ محرومی امداد کردہ۔" (بیاضِ شوق پیام)

منشی دین دیال نے شیخ امام بخش صہبائی کے شاگردوں کے بارے میں کلیات کی تقریظ لکھتے ہوئے اِس طرح اظہارِ خیال کیا ہے:

"جرگۂ تلامذۂ مولانا صہبائی دو گونہ است۔ یکے بایثارِ نقودِ کلامش دست سخا کشادہ تا گرسنۂ چشمانِ نوایدِ علوم ذخیرۂ نعمتہا بردارند، دیگر چوں فرومایگانِ پست ہمت آں جواہرِ زواہر را بہ دُرجِ شفا نہادہ تا گاہے در عالمِ تنگدستیِ معانی و وسعتِ میدانِ قدردانی از نامِ خود بر طبقِ جوہرِ فروش گزارند۔"

(کلیاتِ صہبائی ۱/ ۸۰۶)

اِسی زمانے کے صہبائی کے ایک اور شاگرد لالہ بلدیو سنگھ نامی بھی تھے اُن کے نام بھی بعض خطوط انشائے مکاتیب میں شامل ہیں۔ اُن کے حالات مرزا قادر بخش صابر نے اپنے تذکرہ گلستانِ سخن میں لکھے ہیں۔

یہ یقین ہے کہ ۱۲۶۳ھ/ ۱۸۴۷ء تک صہبائی کے "جرگۂ تلامذہ" میں اور بھی بہت لوگ شامل ہوئے ہونگے لیکن متداول تذکروں میں اُن کے حالات محفوظ نہیں ہیں۔

Marfat.com

۲ وحکایتیں

شیخ امام بخش صہبائی کو سرسید نے "محیِ روزگار" کہا ہے اور یہ واقعہ ہے کہ معاصرین میں شاید ہی کوئی شخص ہوگا جس کے ساتھ اُن کے معاملات اچھے نہ رہے ہوں۔ اُنھوں نے اپنی اردو کی تصانیف میں ذوق، ممنون، مومن وغیرہ کے اشعار تعریفی انداز سے نقل کیے ہیں۔ اِن لوگوں کے حالات اپنے "انتخابِ دواوین" میں شامل کرکے اِن کی شعری خدمات کو خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔ ذوق کو وہ اپنے "الطاف گستراِنِ شفیق" میں شمار کرتے تھے۔ ممنون مرے تو تاریخ کہہ کر اپنے جذباتِ رنج والم کا اظہار کیا ؎

میر ممنون از جہاں بگذشت و نزد عالمے زندگی را از ممات او بود حکم ممات

گزشتہ اوراق میں جو واقعات منقول ہوئے ہیں اُن سے شیفتہ آزردہ، سرسید، غالب اور ٹامسن وغیرہ کے ساتھ صہبائی کے مثبت روابط کا ثبوت ملتا ہے۔ مختلف مآخذ میں صرف ایک دو واقعات ایسے مندرج ہیں جن میں کسی شخص سے اختلاف کا اظہار ہوتا ہے لیکن اُن واقعات کی صحت نہایت مشتبہ ہے۔ مثال کے طور پر

Marfat.com

مولانا محمد حسین آزاد ناقل ہیں :

"نواب مصطفیٰ خاں کی ایک وسیع تقریر ہے۔ مگر ان میں بھی واردات کی بنیاد نہیں لکھی مثلاً یہ کہ مولا بخش قلق مولوی امام بخش صاحب صہبائی کے شاگرد رشید دیوانِ نظیری پڑھتے تھے ایک دن خاں صاحب (حکیم مومن خاں) کے پاس آئے اور ایک شعر کے معنی پوچھے۔ انھوں (مومن) نے ایسے نازک معنی اور نادر مطالب بیان فرمائے کہ قلق مقلد ہو گیا اور کہا کہ مولوی صاحب نے جو معنی بتائے ہیں وہ اس سے کچھ بھی نسبت نہیں رکھتے ..... لیکن نہ وہ شعر لکھا نہ کسی صاحب کے معنی لکھے ہیں۔ ایسی باتوں کو آزاد نے افسوس کے ساتھ ترک کر دیا۔ شفیقِ مکرم معاف فرمائیں"۔ (آبِ حیات ص۴۱۱)

بے سند جو بات بھی کہی جائے وہ اسی لائق ہے کہ اسے نظر انداز کر دیا جائے آزاد کا رد یہ اس بارے میں بالکل صحیح تھا لیکن یہ اُن کا اعجاز ہے کہ جو بھی بات اُن کے قلم سے نکل گئی رائج ہو کر رہی چنانچہ مذکورہ حکایت کو اگرچہ آزاد نے مسترد کر دیا تھا لالہ سری رام نے کسی قدر اضافے کے ساتھ اپنے تذکرے میں داخل کر لیا۔ لکھا ہے کہ :

"مولانا بخشی قلق میرٹھی جو حضرتِ صہبائی کی شاگردی سے پھر کر جناب مومن کے حلقۂ ارادت میں داخل ہو گئے تھے، ان (عبدالکریم سوز) سے کارزارِ شاعری میں مقابل ہوئے۔ قلق کو زار و حزیں ہونا پڑا"۔ (خمخانہ ۴/ ص۲۸۱)

کریم الدین اور مرزا قادر بخش صابر کے تذکروں میں قلق کا شاگرد

عہ ڈاکٹر ناظر حسن زیدی نے بغیر کسی حوالے کے لکھا ہے کہ :

(باقی صفحہ آئندہ پر)

Marfat.com

صہبائی ہونا مذکور نہیں ہے۔ صہبائی سے اِن کے منحرف ہونے کی بات ثابت نہیں ہے۔

مولانا محمد حسین آزاد نے ایک اور واقعہ اِس طرح لکھا ہے:

"۱۸۳۹ء میں بادشاہ کا ایک بیٹا مرزا بلاقی نام گیارہ بارہ برس کی عمر میں مرگیا۔۔۔ استاد مرحوم ۔۔۔ (نے) فرمایا حضور کا ایک قطعہ میں ابھی درست کر کے آیا ہوں (مقطع یہ ہے) ؎

اب حال یہ ہے عالمِ پیری میں اے ظفر
باقی نہیں حواس بھی گفت و شنود کے

کئی دن کے بعد جو پھر آئے، فرمایا، قلعہ سے آتا ہوں، مرزا شاہرخ آج کہنے لگے، بھئی استاد ہم نے مولوی (صہبائی) صاحب کو حضور کا وہ قطعہ سنایا تھا۔ اُنھوں نے کہا شنود نہیں شنید چاہیے۔" (دیوانِ ذوق ص ۲۵۰ تا ۲۵۱)

مرزا شاہرخ ۱۸۴۷ء میں اور مرزا بلاقی ۱۸۴۹ء میں مرے؛ جو شعر مرزا بلاقی کی وفات پر کہا گیا ہو اُس کے بارے میں مرزا شاہرخ کوئی بات نہیں کہہ سکتے تھے۔ حافظ محمود خاں شیرانی نے اِس مبینہ اعتراض سے بحث کرتے ہوئے لکھا ہے:

"مولانا آزاد صہبائی سے جو اُن کے استاد بھی ہونگے کسی وجہ سے خفا ہیں اِسی لیے یہ غلط انداز تیر اُن کی کمان سے نکلا

(حاشیہ صفحہ گزشتہ)

"حکیم مولا بخش قتیل میرٹھی بارہ برس کی عمر میں ۱۸۲۶ء کے قریب تحصیلِ علم کے لیے دہلی آئے۔ فارسی کی تکمیل مولانا امام بخش صہبائی سے کی۔"

(ادبیاتِ مسلمانانِ پاکستان و ہند ۳/۲۳۷)

Marfat.com

ورنہ اُس عہد کے فارسی نگار مثلاً مرزا غالب شنودن کثرت
سے لاتے ہیں"۔ (مقالات شیرانی ۳/ص۱۸۸)
ہمارے نزدیک مسئلہ یہ نہیں ہے کہ لفظ شنودن مروّج تھا یا نہیں
بات یہ تھی کہ اردو میں کوئی بھی گفت و شنود نہیں بولتا۔ گفت و شنید عام
ہے۔ صہبائی فارسی کے عالم ہونے کے باوجود اردو کے روزمرّہ سے بہت
اچھی طرح واقف تھے اور وہ اِسے اہمیت دیتے تھے۔ وہ گفت و شنود
پر گرفت کر سکتے تھے۔

Marfat.com

برائے تربیتِ فرزندان

آثار الصنادید کی اشاعت اول یعنی ۱۲۶۳ھ / ۱۸۴۷ء کے بعد صہبائی دس گیارہ برس تک اور زندہ رہے۔ اس زمانے میں اُن کے علم اور تحریر و بیان میں بھی نہایت پختگی پیدا ہو چکی تھی۔ ان کے بچے بڑے ہو چکے تھے۔ اُن کی تعلیم و تربیت کی ذمہ داری کا احساس بھی صہبائی کو تھا۔ درسی کتابیں لکھنے اور طالب علموں کو پڑھانے کا انھیں کافی تجربہ ہو چکا تھا۔ اس سے فائدہ اٹھا کر انھوں نے فارسی زبان کی ایک قواعد لکھنی شروع کی۔ اس کے آغاز میں [illegible] لکھا:

"اما بعد، ہندی نژاد کج مج زبان، صہبائی ہیچ مدان کہ چون ذرہ بر آستان صافی ضمیران خاک نشین [illegible] سخن جاگزین است، بعرض والا فطرتان [illegible] تنگ مایگان کم سواد نظر بر کتب عربی [illegible] را در مطالعہ عبارات فارسی صرف کنند [illegible] این طریق قدمے بکام دل نزنند لاجرم بر تربیت [illegible] نارسایان ورقے چند در قواعد نحو فارسی [illegible]

Marfat.com

جیسا کہ اقتباس بالا میں صہبائی نے خود کہا ہے۔ یہ رسالہ مختصر ہے اور صرف سترہ صفحوں پر تمام ہو گیا ہے۔ وہ زمانہ تھا جب مرہٹوں کا دہلی سے براہِ راست معاملہ تھا چنانچہ صہبائی کا یہ رسالہ بھی مطبع جہاراجہ ہلکر کی طرف سے اندور میں ۱۸۴۹ء میں دو سو کی تعداد میں چھپا اور اس کی قیمت چار آنے مقرر ہوئی۔ اس واقعہ سے دو باتیں سامنے آتی ہیں۔

اول یہ کہ صہبائی کی تحریر تب دہلی کے باہر بھی مقبول ہو رہی تھیں اور یہ بات یقینی طور سے اُن کے لیے نہایت حوصلہ بخش تھی۔

دوم یہ کہ یہ رسالہ قواعدِ نحو فارسی ۱۲۶۵ھ / ۱۸۴۹ء سے پہلے لکھا جا چکا تھا۔ بیاضِ شوق پیام میں ایک تحریر

"دیباچۂ قواعدِ فارسی موسوم بہ گلزارِ سخن"

کے عنوان سے شامل ہے۔ رسالہ گلزارِ سخن سے ۱۲۶۴ کے عدد برآمد ہوتے ہیں۔ گمانِ غالب ہے کہ اسی سال میں یہ رسالہ لکھا گیا ہوگا اور اس کا نام صہبائی نے تاریخی مقرر کیا ہوگا۔

رسالہ گلزارِ سخن کی تکمیل کے بعد صہبائی نے مینا بازار کی شرح لکھنی شروع کی۔ اس کے دیباچے میں لکھتے ہیں:

"شرحِ نظیری کی مکمل کرنے کے بعد مینا بازار کی شرح لکھنے کا بھی ارادہ ہوا، جو خواص کے نزدیک ظہوری کے خامۂ گہربار کا نتیجہ ہے اور عوام کے نزدیک عمرو زید کے افکار کا ثمرہ لیکن اُس وقت نہیں لکھ سکا۔ آخر جب اپنے فرزند[ع] ان

ع صہبائی کے بعد والی نسل میں مولوی نذیر احمد کو اس بات کے لیے شہرت ہے کہ انھوں نے اپنی بچیوں کے لیے "مرآۃ العروس" نامی کتاب لکھی تھی۔

Marfat.com

دلبند عبدالعزیز و عبدالکریم کو تعلیم دینے کی ضرورت
پیش آئی تو قلم ہاتھ میں لیا، دوات میں تازہ سیاہی
ڈالی اور قدما کی چند فرہنگوں کی مدد سے غور و فکر میں مصروف
ہوگیا۔ نیز متقدمین کی کوئی اچھی شرح میسر نہ ہونے کے
باعث جو رطب و یابس دل میں پایا وہی [illegible]
دسترخوان پر چن دیا " (بحوالہ امام بخش صہبائی ص۱۵)

صہبائی اس حقیقت سے واقف تھے کہ مینا بازار کے مصنف کے بارے میں اختلاف چلا آتا ہے،[۲] لیکن انھیں اس کی شرح لکھنی تھی اس لیے مصنف سے متعلق بحث میں پڑے بغیر انھوں نے اس کام کو شروع کر دیا۔ ڈاکٹر خواجہ محمد حامد نے اس بارے میں لکھا ہے:

"صہبائی نے اس شرح کے لکھنے میں تقریباً پانچ برس محنت کی۔ خاتمۂ شرح میں فرماتے ہیں کہ میں نے الفاظ کی تحقیق، عبارات کی تشریح اور متعلقات کی توضیح کما حقہ ادا کیا ہے" اُن کے اس دعوے میں مبالغہ نہیں کہ اب طالبانِ علم کو شبستانِ تدریس کے نادر فروشوں کا نیاز مند نہیں ہونا پڑیگا" (امام بخش صہبائی ص۱۶)

ہمارے خیال میں یہ پانچ برس والی بات صحیح نہیں معلوم ہوتی صہبائی نے

عـ۱ صہبائی سے پہلے مینا بازار کی جو شرحیں لکھی گئیں اُن میں سے دو یہ ہیں: شرحِ خیال از ارشد اشرف متخلص بہ خیال جو ۱۱۶۱ھ/۱۷۴۸ء میں مکمل ہوئی۔ شرح مینا بازار از ابوالمعالی عبدالرزاق بن محمد اسحاق سورتی

عـ۲ ہندوستان کے بعض مطبوعہ نسخوں پر اسے ارادت خاں واضح متوفی ۱۱۲۸ھ/۱۷۱۶ء سے منسوب کیا گیا ہے۔

Marfat.com

خود اعتراف کیا ہے کہ "شرح سہ نثر" کی تکمیل کے بعد انھیں مینا بازار کی شرح لکھنے کا خیال ہوا لیکن وہ اس کام کو نہیں کر سکے۔ اس درمیانی مدت میں وہ دوسرے علمی کاموں میں مصروف رہے۔ زیادہ سے زیادہ جو بات کہی جا سکتی ہے یہ ہے کہ ایک خیال جو پانچ برس پہلے ذہن میں آیا تھا، اس کا نتیجہ شرح مینا بازار ہے۔ اس کتاب کو انھوں نے ۱۲ ربیع الثانی ۱۲۶۵ھ مطابق مارچ ۱۸۴۹ء میں مکمل کیا تھا۔ اس وقت ان کے چھوٹے صاحبزادے عبدالکریم کی عمر پندرہ برس کے قریب ہو گئی تھی۔ اس کم عمر میں اس کا مینا بازار جیسی کتابوں کے پڑھنے کے قابل ہو جانا لائق توجہ بات ہے۔

اب صہبائی کی عمر پینتالیس برس کی ہو چکی تھی۔ عمر بڑھتی ہے تو علم کا بھی شباب آتا ہے فکر و شعور میں پختگی اور تیزی اور قلم میں روانی آتی ہے لیکن صہبائی کو رات دن کی محنت، علالت اور عسرت نے جس انھوں نے عمر کا بڑا حصہ گذارا تھا، بہت کمزور کر دیا تھا۔ تھکن محسوس ہونے لگی اور وہ آرام کی خواہش کرنے لگے لیکن ان کی تحریروں نے طالبانِ علم کو ایسا گرویدہ بنا دیا تھا کہ وہ فرمائشیں کرتے رہتے تھے۔ صہبائی اپنی طبعی مروت اور علمی کاموں سے غیر معمولی شغف کی وجہ سے ان فرمائشوں کو پورا کرتے رہنے پر مجبور تھے۔ شرح مینا بازار کے بعد "رقعاتِ ظہوری" کی شرح کا کام ہاتھ آ گیا۔

دیباچے میں کہتے ہیں:

"جب شرح مینا بازار مکمل ہو گئی تو طے کیا کہ اب بقیہ زندگی آرام کرنے میں گذاروں گا طالبین نے اصرار کیا کہ رقعاتِ ظہوری (پنج رقعہ) کی بھی شرح لکھوں لیکن طبیعت

Marfat.com

کی کسی مندی سے راضی نہیں ہوا۔ اتنے میں کشورِ جہانِ دل
کے کارفرما جواد الدولہ سید احمد خاں کی فرمائش بھی شرحِ
مذکور کے لیے ہمیں جو رد نہیں کی جا سکتی تھی چنانچہ شرحِ
میتا بازار کے اتمام کے دو ہی تین دن کے بعد یہ بار بھی اُٹھانا
پڑا۔" (بحوالہ امام بخش صہبائی ص۱۶۳)

یہ شرح ایک سو چوراسی صفحوں پر مکمل ہوئی اور اس کام کو بھی انھوں نے
اپنی عادت کے مطابق پوری تندہی سے مکمل کیا۔

تقریباً اسی زمانے میں شیخ امام بخش صہبائی نے علمِ عروض و قافیہ کی
ضروریات کی طرف بھی توجہ کی اور بچانوے صفحوں پر محیط ایک رسالہ
"کافی در علم قوافی" لکھا۔ اس کی تمہید میں اُنھوں نے بیان کیا ہے:

"لوگوں کا رجحان شعر گوئی کی طرف ہونے کے باوجود اُن میں
سے اکثر حضرات عروض و قافیہ کے اصول و قواعد سے ناواقف
ہیں اور طبیعت کی موزونی کے زعم میں اُن کی تحصیل کو
کارِ عبث سمجھتے ہیں۔ وہ نہیں جانتے کہ اُن کا مصرع کس بحر
میں ہے اور اُن کی نظم کے قافیوں کی تعیین کس طرح
ہونی چاہیے۔ لہٰذا اُن سے مضحکہ خیز غلطیاں سرزد ہوتی
ہیں۔ نظر بریں صہبائی نے اُن کی رہنمائی اور اپنے فرزندوں
کی سخن آموزی کے لیے یہ رسالہ تالیف کیا ہے۔"

(بحوالہ امام بخش صہبائی ص۱۳)

اس طرح یہ کتاب بھی صہبائی نے اپنے فرزندوں کے لیے لکھی تھی۔
اُس وقت اُن کے فرزند "سخن آموزی" میں مصروف تھے اور کچھ
کچھ شعر کہنے لگے تھے۔

ایک قابلِ توجہ نکتہ اس مقام پر سامنے آتا ہے کہ اگرچہ دلی

Marfat.com

کالج کے نصاب میں قواعد کے ساتھ ساتھ بدیع وبیان اور عروض کی تعلیم بھی شامل تھی، اُسی وقت سے اِس خیال کو رواج ہونے لگا تھا کہ شعر گوئی کا انحصار موزونیتِ طبع پر ہے اور عروض سے واقفیت کو بعض لوگ "کارِ عبث" سمجھنے لگے تھے یہ خیال وقت کے ساتھ ساتھ ذہنوں میں جڑ پکڑتا چلا گیا یہاں تک کہ غدر کے بعد کھل کر یہ بات کہی گئی کہ "نفسِ شعر وزن کا محتاج نہیں" اور اِس بارے میں بس اتنی بات تسلیم کی جا رہی تھی کہ :

"اِس میں شک نہیں کہ وزن سے شعر کی خوبی اور اُس کی تاثیر دوبالا ہو جاتی ہے"۔ (مقدمہ شعر و شاعری ص ۳۱)

چنانچہ کچھ ہی مدت کے بعد مولوی محمد اسماعیل میرٹھی نے بلینک ورس لکھ کر اُردو شاعری میں ایک بالکل نیا تجربہ کیا ہے۔

شیخ امام بخش صہبائی کے رسالہ کافی کے بارے میں ڈاکٹر خواجہ محمد حامد نے اِس طرح اظہارِ خیال کیا ہے:

"اِس کی تالیف میں صہبائی نے تحقیق کا پورا حق ادا کیا ہے کوئی بات بدون حوالہ سپردِ قلم نہیں کی ہے۔ چنانچہ عروض و قافیہ پر عربی و فارسی میں لکھی جانے والی کتابوں کے تینتیس مشہورِ وقت عالموں کے نام رسالے میں بار بار آئے ہیں۔ پانچ قابلِ قدر فرہنگوں سے بھی استفادہ کیا ہے"۔

(امام بخش صہبائی ص ۱۳)

اِس رسالے کا سالِ تصنیف متعین نہیں ہے البتہ اِس بنا پر کہ اس کے دیباچے میں اپنے فرزندوں کی سخن آموزی کا ذکر کیا ہے خیال کیا ہے کہ صہبائی نے شرحِ مینا بازار اور شرحِ رقعات کی تکمیل کے بعد اِس کام کو کیا ہو گا۔

رسالہ کافی کی تکمیل کے بعد صہبائی نے طالب علموں کی سہولت کے لیے اِس کے مطالب کو نہایت اختصار کے ساتھ ایک اور رسالے میں قلمبند کر دیا

Marfat.com

جو کلیات صہبائی کی پہلی جلد میں صرف دو صفحوں پر مکمل ہو گیا ہے۔ منشی دین دیال مرتب کلیاتِ صہبائی نے فہرست میں اِس کا تعارف اِس طرح کرایا ہے:

"وافی شرحِ کافی" شرحِ مختصر متنِ متین نکاتِ دقیقہ و رموزِ غریبۂ علمِ قوافی ست"

مرزا قادر بخش صابر نے اپنے تذکرہ گلستانِ سخن کے دیباچہ کی بحثوں میں صہبائی کے اِس مختصر رسالے سے چند مقاموں پر استفادہ کیا ہے اور اِس امر کا اعتراف کرتے ہوئے اُنھوں نے اِس قسم کے جملے لکھے ہیں۔

"یہ مطلب ہے اُس عبارت کا کہ جناب مستطاب استادی و مولائی امام بخش صہبائی سلمہ اللہ تعالیٰ نے رسالہ وافی میں قلمِ جواہر رقم سے تحریر فرمای" (گلستانِ سخن ۱/ ص ۱۳۲)

صہبائی کے دونوں رسالوں یعنی کافی اور وافی کا تعارف کراتے ہوئے صابر نے لکھا ہے:

"اور علمِ قوافی میں ایک رسالہ موسوم بہ کافی اُس زبدۂ اربابِ تمیز نے عبارت وجیز میں ترقیم کیا ہے۔ ہر چند ایک ورق عبارت سے بیش نہیں لیکن تفصیلِ معانی سے ایک کتاب سے زاید تصوّر کیا جاتا ہے اور اِس مجمل کی شرح میں ایک اور رسالہ تحریر فرمایا ہے مسمّٰی بہ وافی کہ مسایلِ دقیقۂ کمال تفصیل سے صورت پذیر ہوئے ہیں۔

ماہرانِ فن انصاف کریں گے کہ مطالبِ مہمّہ کی توضیح علی الخصوص اوصاف و القاب کا بیان اور تجریدِ معنی اُن اوصاف سے قافیہ کے خالی ہونے کی حقیقت میں اختلافِ مذاہب کی تفصیل کس طرح جدید اور اندازِ تازہ کے ساتھ جلوہ گر ہے۔

Marfat.com

دشوار پسند اِن باریک بیں نے اِس نسخے کو دیکھ کر صاف نیتی کی داد دی اور کمالِ منصفی سے زبان پر لائے کہ ہم رسائل مشہورہ میں تحصیل کے وقت اِن مسائلِ باریک سے کچھ اپنی ناواقفی اور کچھ ادیب کی بے اعتنائی سے ایسے غافل گذر گئے کہ راہِ پُرنشیب و فراز میں گویا نشیب و فراز ہی نہ تھا۔"

(گلستانِ سخن ۲ / ص ۱۳۸)

کلیاتِ صہبائی کی پہلی جلد میں یہ دونوں رسالے شامل ہیں۔ اِن کو دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ صابر کے اِس اقتباس میں رسالوں کی کیفیت کا بیان برعکس ہو گیا ہے یعنی صحیح یہ ہے کہ اصل رسالہ "کافی" تھا۔ اُس کا اختصار رسالہ وافی میں پیش کیا گیا ہے۔ درگا پرشاد نادر سے بھی اُن کے بارے میں وہی سہو ہوا ہے لکھا ہے۔

"علمِ قافیہ میں مولانا (صہبائی) مرحوم نے ایک رسالہ دو صفحۂ خرد کا لکھا۔ پھر اُس کی شرح چودہ جُزو میں زیبِ ارقام فرمائی۔ اِس رسالہ مسمّٰی بہ کافی در علمِ قوافی کا ترجمہ بندہ نے رسالۂ نحوِ فارسی جنابِ ممدوح کے ترجمہ کے ہمراہ چھپوا دیا ہے اور اصل فارسی دونوں رسالوں کی جناب کے کلیات میں بھی شایع ہوی ہے۔"

(مراۃ خیالی ص ۱۲۷)

Marfat.com

قولِ فیصل وغیرہ

ہندوستان میں فارسی کے دو باکمال سراج الدین علی خاں آرزو اور شیخ محمد علی حزیں اصفہانی کے ادبی اور علمی مناقشوں کو نہایت شہرت ملی۔ اُن کی کیفیت اس طرح ہے کہ خان آرزو نے "تنبیہ الغافلین" نامی ایک کتاب لکھی جس میں اُنھوں نے شیخ کے تین سو سے زائد شعروں پر اعتراض کیے۔ شیخ نے بردباری سے کام لیکر خاموشی اختیار کی لیکن اُس کے عقیدتمند اِس بات کو برداشت نہ کر سکے۔ اُنھوں نے خان آرزو کے اعتراضوں کا جواب دیا اور پھر جواب الجواب کا سلسلہ چل پڑا۔ خان آرزو کی "تنبیہ الغافلین" کے بعد کسی شخص نے شیخ علی حزیں کی مخالفت میں ایک رسالہ "اعتقاد الحق" کے نام سے لکھا۔ امام بخش صہبائی شیخ علی حزیں کے عقیدتمند تھے۔ اُنھوں نے ترجمہ حدایق البلاغت میں اُن کا نام اِس طرح لکھا تھا:

"شیخ العارفین علی حزیں طاب ثراہ" (ص ۳۴)

شیخ امام بخش صہبائی خود کو فخریہ "ہندی نژاد" کہتے تھے۔ وہ ہندوستانیوں کے علمی کارناموں کے دل سے معترف تھے اور اُنھوں نے اِن کی اہمیت کو

Marfat.com

منوا لینے کی پوری کوشش کی تھی۔ دراصل اُن کی وطن دوستی ہی اِس علمی معرکے کا سبب بنی تھی۔ اُن کی نظر سے جب رسالہ "احقاق الحق" گزرا تو وہ اپنے قلم کو روک نہ سکے۔ اِس کے رد میں اُنھوں نے ایک مختصر رسالہ "اعلاء الحق" کے نام سے لکھ ڈالا جو صرف چودہ صفحوں پر مشتمل ہے۔ اِس مختصر رسالے میں صہبائی نے "احقاق الحق" کے تمام اعتراضوں کا جواب دینے کی کوشش نہیں کی ہے۔ اُن کا کہنا بس یہ ہے کہ:

"شیخ بھی استاد ہیں اور فاضل اور اہلِ زبان۔ اگر خاقانی و انوری کی سند معتبر ہے تو شیخ کی سند کیوں غیر معتبر ہے؟"

صہبائی کو رسالہ احقاق الحق کے مصنف کا نام اور حال معلوم نہ تھا۔ اُنھوں نے اِس کی تجسس کی ضرورت بھی محسوس نہیں کی۔ ایک جگہ اُس کا ذکر اِس طرح کیا ہے کہ:

"معرکہ سازِ عرصۂ لاف، عنانِ گسترِ نفس سوزی ہائے گزاف، تہمت زدۂ امتیازِ باطل و حق صاحب نسخۂ احقاق الحق"

اور عام طور سے اُسے "معترض" کے نام سے یاد کیا ہے۔ کلیاتِ صہبائی کے مرتب نے البتہ فہرست میں اِس رسالے کو خان آرزو سے منسوب کر دیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اِس انتساب کی ذمہ داری صہبائی پر نہیں ڈالی جا سکتی۔

صہبائی کے رسالہ "اعلاء الحق" کا سالِ تصنیف متعین نہیں ہے البتہ اِس بنا پر کہ یہ اُنھوں نے "قولِ فیصل" سے پہلے لکھا تھا اِسے ۱۲۶۷ھ / ۱۸۵۱ء سے کچھ قبل کا تصنیف کردہ سمجھا جا سکتا ہے۔

آرزو اور حزیں کے معرکے میں صہبائی نے "قولِ فیصل" لکھ کر براہِ راست حصہ لیا۔ مرتب کلیاتِ صہبائی نے فہرست میں صہبائی کے اِس رسالے کا ذکر ان لفظوں میں کیا ہے:

"رسالہ قول فیصل" در جوابِ رسالہ "تنبیہ الغافلین"

Marfat.com

تصنیفِ خانِ آرزو بطور محاکمہ در ارتفاعِ جرح و قدحِ
خانِ آرزو بر کلام شیخ علی حزیں۔"

جناب احمد منزوی نے اِس کا تعارف کراتے ہوئے یہ اطلاع دی ہے کہ:

"قولِ فیصل در ردِّ تنبیہ الغافلینِ سراج الدین علی خاں
آرزو کہ اعتراضاتے بر سردہ ہائے حزیں لاہیجی داشتہ است
کہ ضمنِ کلیاتِ او، جلد دوم، لکھنؤ۔ نولکشور ۱۲۹۹ھ چاپ
شدہ است۔ ایں قولِ فیصل بکوششِ پرفسور وزیر الحسن
عابدی بہ زبانِ اردو ترجمہ و در مجلۂ نقوش (لاہور)
چاپ شدہ است۔ و نیز ترجمۂ دیگر ازاں چاپ نولکشور
لکھنؤ بے تاریخ دیدہ ام۔" (فہرست مشترک ۵/ ص۸۵)

صہبائی کے عزیز شاگرد پنڈت دھرم نراین نے اِس رسالے قولِ فیصل
کو بہت اہتمام کے ساتھ ۱۸۶۲ء میں مطبعِ نظامی کانپور سے چھپوایا
تھا۔ اصل رسالہ ۱۶۴ صفحوں پر مشتمل ہے۔ اِس کے بعد صہبائی کا
کہا ہوا فارسی میں ایک منظوم "خاتمہ" ہے۔ پھر اہلِ مطبع کے "خاتمۃ الطبع"
کے بعد مولوی محمد حسین ہجر کی منظوم تقریظ ہے۔ سب کے بعد پنڈت
دھرم نراین کا تین صفحوں پر مشتمل ایک "خاتمۃ الطبع" ہے۔ اس میں
پنڈت جی نے لکھا ہے:

"روزے ازیں ماجرا پُرس ... فرمودند کہ مگر ندانی کہ پیش ازیں
خانِ آرزو با علی حزیں عبث در آویخت [illegible]
را بیفایدہ بر خاک ریخت، رسالہ تنبیہ الغافلین نام درین باب
ترتیب داد ..... اگر زمانہ یارِ [illegible] سازگار است
راہِ صلحِ کل پیش گرفتہ در خصومتِ ایں قضیہ رسالہ ترتیب
میدہم کہ آں را قولِ فیصل نام تواں نہاد۔" (قولِ فیصل ص۱۶۳)

Marfat.com

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اِس رسالے کے لکھنے کا ارادہ اور اِس کا مجوزہ نام بھی صہبائی کے ذہن میں بہت پہلے سے تھا لیکن زمانے نے فرصت نہ دی کہ وہ اپنی اِس آرزو کو جلد تر پورا کرتے۔ بہرحال دو رمضان ۱۲۶۷ھ/ ۱۸۵۱ء کو انھوں نے رسالہ "قولِ فیصل" لکھنا شروع کیا۔ کہتے ہیں:

"چوں سرآغازِ ایں تحریر صبحگاہ دوم رمضان ۱۲۶۷ اتفاق افتادہ بود، عددِ سالِ شروع نیز ازیں نقاب کشود"۔ (قولِ فیصل ص۸)

اِس مقام پر دو باتیں لائقِ ذکر ہیں۔ صہبائی راسخ العقیدہ، پابندِ مذہب، باعمل سنّی مسلمان تھے۔ رمضان کے مہینے میں بھی وہ اپنے دنیاوی اور علمی کاموں کو معمول کے مطابق جاری رکھتے تھے۔

دوسری بات یہ کہ تاریخ گوئی کا انھیں ایسا ملکہ تھا کہ بہت کم لوگوں کو ہوگا۔ اُن کے کئی مادہ ہائے تاریخ گذشتہ اوراق میں نقل کیے جا چکے ہیں۔ اُن سے ہمارے اِس دعوے کی تائید ہوتی ہے۔ قولِ فیصل کے آغاز کی تاریخ بھی نہایت عمدہ اور برمحل کہی ہے:

میکنم آغازِ کلامِ ادب
۱۲۶۷

اِس میں نہ تعمیہ ہے، نہ تخرجہ۔ ایک بات کہی ہے اور اُس سے تاریخ برآمد ہوتی ہے۔

قولِ فیصل کی تکمیل کے بعد دو تین برس کے اندر شیخ امام بخش صہبائی نے جو علمی کام انجام دیے اُن کے بارے میں تفصیلات کا علم نہیں ہے۔ مرزا قادر بخش صابر کے تذکرے میں البتہ صہبائی کے ایک رسالہ "تحقیقِ دوائر" کا ذکر آیا ہے۔ اِس طرح:

"در تحقیقِ دوائر میں ایک رسالہ عجیب و غریب تالیف کیا ہے کہ نکاتِ باریک جو کملائے فن کے واسطے منزال اقدام اور مذاقِ اقلام شمار میں آتے ہیں اِس میں بسط و تفصیل سے

Marfat.com

مرتسم ہیں کہ ان کا مطالعہ باریک بینانِ دُشوار فہم کی نظر میں
طرفہ افادہ ہے لیکن افسوس کہ کمفرصتی اِس قدر مہلت
نہیں دیتی کہ تبیّض تک نوبت پہنچے "

(گلستانِ سخن ۲/ صـ۱۳۷)

بظاہر یہ رسالہ صہبائی نے اُس زمانے میں لکھنا چاہا تھا جب صابر اپنا تذکرہ تالیف کر رہے تھے اِس اعتبار سے اِس رسالے کا سالِ تصنیف ۱۲۷۰ھ/ ۱۸۵۴ء خیال کیا جا سکتا ہے نہیں کہا جا سکتا کہ صہبائی کو اس رسالے کے صاف کرنے کا موقع مل سکا تھا یا نہیں ۔

Marfat.com

ایک معرکہ

شیخ امام بخش صہبائیؒ کو آخری عمر میں مذہب و عقیدے سے متعلق ایک معرکہ میں بھی حصّہ لینا پڑا۔ مولانا الطاف حسین حالی نے اُس کی کیفیت اِس طرح بیان کی ہے:

"ایک بار بادشاہ سخت بیمار ہوئے۔ اُس زمانے میں مرزا حیدر شکوہ جو اکبر شاہ کے بھتیجے اور مرزا سلیمان شکوہ کے بیٹے تھے وہ بھی لکھنؤ سے آئے ہوئے تھے اور بادشاہ کے ہاں مہمان تھے۔ اُن کا مذہب اثنا عشری تھا جب بادشاہ کو کسی طرح آرام نہ ہوا تو مرزا حیدر شکوہ کی صلاح سے خاکِ شفا دی گئی اور اُس سے بادشاہ کو صحت ہو گئی۔ مرزا حیدر شکوہ نے نذر مانی تھی کہ بادشاہ کو صحت ہو جائے تو حضرت عباس کی درگاہ میں جو لکھنؤ میں ہے عَلَم چڑھاؤں گا۔ چنانچہ اُنھوں نے لکھنؤ جا کر بادشاہ کو عرضداشت بھیجی کہ میرا منقدور نذرانہ ادا کرنے کا نہیں ہے حضور مدد فرمائیں۔ یہاں سے بادشاہ نے کچھ روپیہ مرزا حیدر شکوہ کو بھجوا دیا اور اُنھوں نے بڑی دھوم دھام سے عَلَم چڑھایا جس میں اودھ کا تمام شاہی خاندان اور امرا و علما سب شریک

Marfat.com

تھے اور مجتہد العصر کے ہاتھ سے عَلَم چڑھایا گیا۔ اِس واقعے کے بعد یہ بات عموماً مشہور ہو گئی کہ بادشاہ شیعہ ہو گئے اِس شہرت کا بادشاہ کو بہت رنج ہوا اور حکیم احسن اللہ خاں مرحوم نے اس کے تدارک کے لیے کچھ رسالے شائع کرائے اور بہت سے اشتہارات کوچوں اور بازاروں میں چسپاں کرائے گئے اور بادشاہ کے حکم سے مرزا (غالب) صاحب نے بھی ایک مثنوی زبان فارسی میں لکھی جس کا نام غالباً دمغ الباطل رکھا تھا اور جس میں بادشاہ کو تشیع کے اتہام سے بَری کیا گیا تھا۔" (یادگارِ غالب)

اس اقتباس میں چند باتیں صحیح نہیں ہیں۔ مرزا حیدر شکوہ کے والد کا نام مرزا اکام بخش تھا جو مرزا سلیمان شکوہ کے بیٹے تھے چنانچہ مولانا محمد حسین آزاد نے بھی لکھا ہے:

"مرزا نور الدین اور مرزا حیدر شکوہ دو تیموری شاہزادے .... مرزا سلیمان شکوہ خلف شاہ عالم بادشاہ کے پوتے تھے۔ ۱۸۵۱ء میں دلّی میں آئے.... (بادشاہ نے) اپنا سمجھ کر اُن پر اعتماد ظاہر کیا۔"

(دیوان ذوق ص ۱۹۳)

دوسری بات یہ ہے کہ مثنوی "دمغ الباطل" "مرزا غالب کی نہیں بلکہ صہبائی کی تصنیف ہے نیز اس سلسلے کے واقعات اس طرح ہیں:

مرزا اسد اللہ خاں غالب نے ۶ ذیقعدہ ۱۲۶۹ھ کو نبی بخش حقیر کے نام ایک خط میں بادشاہ کے بارے میں لکھا ہے کہ "مرض جاتا رہا اور ضعف باقی ہے"۔ پھر ایک اور خط میں انھوں نے اطلاع دی ہے کہ:

"بعد محترم سنا جاتا ہے کہ غسلِ صحت ہو گیا بادشاہ اچھے

Marfat.com

ہیں۔ رہا ضعف وہ لازمۂ عمر ہے۔"

اس طرح علم چڑھانے کا واقعہ ۱۲۷۰ھ / ۱۸۵۴ء کا ہونا چاہیے۔ جب دہلی میں یہ خبر مشہور ہوئی تو علما نے بادشاہ سے کیفیت معلوم کی۔ بادشاہ نے اپنے سُنّی ہونے کا اقرار کیا اور مجتہد العصر لکھنؤ کے علاوہ ایک خط "امین الدولہ سیمن فریزر بہادر دلیر جنگ صاحب ایجنٹ شاہجہان آباد" کے نام بھی لکھا۔ اس میں ہے:

"بملاحظہ قطعات سوالات علما و مشایخ ایں شہر بوضوح پیوستہ کہ از روے اخبار و خطوط لکھنؤ بدریافت ایں مردم رسیدہ کہ بتاریخ ششم ربیع الاول مرزا حیدر شکوہ بہادر و مرزا نور الدین بہادر شیعی مذہب نبیرگان مرزا سلیمان شکوہ بہادر در لکھنؤ علے بکمال تجمل بہ ہمراہی عمایدِ آں شہر برداشتہ بدرگاہِ حضرت عباس بردند..... مرثیہ بزبانِ اردو کہ متضمن بے ادبیِ صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین بودہ در مجمع کثیر بآواز بلند خواندہ، در مقطعِ آں مرثیہ تخلصِ حضور پُر نور درج کردہ و قطعۂ شقۂ مہریِ خاص مشعرِ ترک کردنِ مذہبِ اہلِ سنّت و جماعت و اختیار نمودنِ مذہب اہلِ تشیع و وثوقِ ارادۂ تعمیرِ امامباڑہ و اختیارِ تعزیہ داری بر دوام موسومۂ مجتہدِ مذکور ظاہر ساختہ بندگانِ والا را باتہامِ مذہبِ روافض متہم و بدنام ساختند۔ و چوں ایں ہمہ غلط و بے اصل و محض افترا و بہتان است.... ایں ہمہ تصنع و دروغ آرائی مرزایان مذکور است کہ بحضورِ پُر نور منسوب کردہ اند..... لہذا زیبِ ارقام می باید کہ .... بمقتضاے دولت خواہی و خیر اندیشی بہ جہتِ رفعِ ایں اتہام و بدنامیِ بندگانِ اقدس خطِ انگریزیِ خود بنامِ ایجنٹ بہادر لکھنؤ بمزید تاکید بر نگارد کہ شقۂ جعلی مہریِ خاص از

Marfat.com

مجتہدِ مذکور بہر نوع کہ تواند طلبیدہ زود ترا رسال دارد"
(نگار، رام پور، فروری ۱۹۶۲ء ص ۱۵)

اِس کے جواب میں مجتہد العصر نے ریذیڈنٹ اور بادشاہ کو لکھ دیا کہ بہادر شاہ کے آبا و اجداد بھی شیعہ ہی تھے۔ لکھنؤ کے مطبعِ علی بخش سے ایک "مثنوی شوکتِ حیدری در جوابِ کلماتِ خبیثاتِ خوارجِ دہلوی" کے نام سے چھپوا کر شایع کی گئی جس میں حیدر شکوہ نے کہا ہے کہ ؎

چو در لکھنؤ آمدم از حضور — فریبے نمودند اصحابِ زور
چناں طبع را منحرف ساختند — کہ بر کردۂ خود نہ پر داختند
چوں آں قوم بدکیش ناچار کرد — ز ارسال و اصرار انکار کرد

اِس سلسلے میں بادشاہ کی طرف سے بھی ایک مثنوی مرزا غالب سے لکھوا کر شایع کی گئی چنانچہ مولانا حالی نے لکھا ہے:

"اِس مثنوی میں مرزا نے اپنی طرف سے کوئی بات نہیں لکھی تھی بلکہ جو مضامین حکیم احسن اللہ خاں نے بتائے تھے اُن کو فارسی میں نظم کر دیا تھا۔ جب یہ مثنوی لکھنؤ پہنچی تو مجتہد العصر نے مرزا سے دریافت کیا کہ آپ نے خود مذہب شیعہ اور مرزا حیدر شکوہ کی نسبت اِس مثنوی میں ایسا اور ایسا لکھا ہے؟ مرزا نے لکھ بھیجا کہ میں ملازم شاہی ہوں۔ جو کچھ بادشاہ کا حکم ہوتا ہے اُس کی تعمیل کرتا ہوں۔ اِس مثنوی کا مضمون بادشاہ اور حکیم احسن اللہ خاں کی طرف سے اور الفاظ میری طرف سے تصوّر فرمائے جائیں۔" (یادگارِ غالب)

غالب کا خط مجتہد العصر کے نام پنج آہنگ طبع دوم (دہلی) اور طبع سوم (لکھنؤ) میں شامل ہے جس میں اُنھوں نے کہا ہے کہ:

"در نگارشِ مثنوی مضمون از خرد است و لفظ از من"

Marfat.com

اس خط کا خلاصہ اس طرح ہے:

"میرا گناہ سوائے اس کے کچھ نہیں کہ میں نے بادشاہ کے فرمان کی تعمیل کی تھی ... جس طرح نغمے کی تخلیق میں مغنی مضراب لگاتا ہے اور تار سے آواز نکلتی ہے اُس طرح مثنوی لکھنے میں مضمون سارا بادشاہ کا تھا اور صرف لفظ میرے تھے۔ اس کے علاوہ یہ سارے شعر میرے نہیں۔ اوروں نے اس میں اپنی طرف سے اضافے بھی کیے ہیں۔"

(بیخ آہنگ، آہنگِ پنجم ص۵۵)

غالب کی اس گواہی سے بادشاہ کے عقیدے کا مسئلہ حل ہو جاتا ہے۔ پورا واقعہ بھی غالب ہی کے لفظوں میں اس طرح ہے:

"علمائے نامدار و مشایخِ کبار نے بادشاہ سے استفسار کیا تو بادشاہ کی زبانِ مبارک گہرفشاں ہوئی، حقیقتِ مذہب اہلِ سنّت و جماعت بیان ہوئی۔ سو وطنِ علما اس مجمعِ عظیم میں یہ سرایۂ حسنِ ظن جملہ گرہوا۔ خاص و عام کہ اعلا حضرت کا ثباتِ قدم مسلکِ تسنّن پر برابر رہا۔ مضامین ارشاد کیے ہوئے اعلا حضرت کے بموجب ارشاد قالبِ نظم میں ڈھلے۔ ناگاہ جانب سے اُس نظم کے جواب میں کچھ وار چلے۔ یہ گناہگار بیگناہ بھی بہ ذمِ ممدوح ہوا اور خنجرِ زبان کے زخم سے مجروح ہوا۔" (اردوے معلا حصہ۲، ص۹)

غالب کے اظہارِ برائت کے بعد لکھنو سے ۱۲۷۱ھ میں ایک مثنوی شایع ہوئی جس کا عنوان یہ تھا:

"مثنوی شیعیانِ علیؓ در ردِّ مثنوی جعلی دہلی"

شیخ امام بخش صہبائی اگرچہ اپنے عقاید میں نہایت متوازن

Marfat.com

اور مزاجاً معتدل تھے، غالب کے رویّہ اور اُن کی مثنوی کے جواب میں "مثنوی شیعیان" کو دیکھکر اپنی طبیعت کو نہ روک سکے اور اُنھوں نے اُس کے جواب میں فارسی میں خود ایک مثنوی "دمغ الباطل" کے نام سے لکھ ڈالی۔ یہ مثنوی ۱۲۷۱ھ/۵۵-۱۸۵۴ء میں افضل المطابع سے چھپی تھی۔ اِس مثنوی سے معلوم ہوتا ہے کہ "مثنوی شیعیان" کے نظم کرنے والے میر دوست علی خلیل تھے اور اُن کی رہنمائی مفتی میر محمد عباس شوستری نے کی تھی۔ مفتی صاحب چونکہ کالے تھے صہبائی نے اپنی مثنوی میں اُن سے اِس طرح خطاب کیا ہے ؎

ایں سیاہت تباہ خواہد کرد　　دل چو رویت سیاہ خواہد کرد

یہ بات توجہ طلب ہے کہ صہبائی کی زندگی میں اُن کی مثنوی کا جواب نہیں لکھا جا سکا۔

۱۸۵۷ء کے غدر میں صہبائی شہید کر دیے گئے۔ بادشاہ جلاوطن ہو کر رنگون چلے گئے۔ اِس کے بعد اُس قضیے کو ختم ہو جانا چاہیے تھا لیکن مذہب کے جھگڑوں میں جب ذاتی معاملے شامل ہو جائیں تو اُن کا طے ہونا تقریباً ناممکن ہو جاتا ہے۔ ۱۲۷۶ھ مطابق ۶۰-۱۸۵۹ء میں جب دہلی اور لکھنؤ دونوں کی بادشاہتیں ختم ہو چکی تھیں، مفتی صاحب کو فرصت ملی تو اُنھوں نے مرحوم صہبائی کی مثنوی کا جواب لکھنے کی فکر کی۔ اُنھوں نے صہبائی کو دیکھا نہیں تھا اور اب اُن کا دیکھنا ممکن بھی نہیں رہ گیا تھا اِس لیے اپنی مثنوی میں اِس اعتراف کے باوجود کہ ع من ندارم پادشاہی فرماتے ہیں ؎

ہیچ از ننگ و نام بخشش نیست　　جز بہ نام از امام بخشش نیست

مفتی صاحب کو اِس جوابی مثنوی کی تکمیل میں ایک برس لگا یعنی ۱۲۷۷ھ میں انیس [illegible]

Marfat.com

مرزا اسد اللہ خاں غالب کو اِس معرکے میں اہلِ دہلی کے سامنے جو رُسوائی اُٹھانی پڑی تھی اور صہبائی نے اِس معاملے میں حکیم احسن اللہ خاں اور بہادر شاہ کے ساتھ جس طرح تعاون کیا تھا اُس کے نتیجے میں مرزا کو صہبائی سے ایسی کد ہو گئی کہ اُنھوں نے اپنی تحریروں میں بار بار صہبائی کے خلاف غم و غصہ کا اظہار کیا ہے۔ شمس العلما مولانا محمد ذکاء اللہ نے لکھا ہے:

"اب مرزا غالب کا حال یہ ہے کہ سوائے شاعر ہونے کے کوئی اور خوبی اُس میں نہ تھی حسد اِس قدر تھا کسی کی عزت کو دیکھ سکتا تھا۔ سنگدل ایسا تھا کہ سارے بھائی بندوں کی حق تلفی کرنے میں اُس کو افسوس نہ تھا۔۔۔ رند مشرب ایسا تھا کہ کہا کرتا تھا کہ صہبائی شعر کہنا کیا جانے، نہ اُس نے شراب پی، نہ قمار بازی کی، نہ معشوقوں کے ہاتھ سے چوٹیاں کھائیں، نہ جیلخانے میں پڑا۔"

(مکتوب بنام آزاد، منگار رام پور فروری ۱۹۶۳ء)

حافظ احمد حسن شوکت میرٹھی نے غالباً اِسی بنیاد پر لطیفہ تراشا کہ کسی مشاعرے میں مرزا نے صہبائی سے خطاب کر کے کہا تھا کہ:

"مولانا آپ شعر کے معنی کیا سمجھیں گے، نہ آپ نے کبھی رنڈی بازی کی، نہ خانگی بازی کی، نہ امرد بازی کی، نہ فاعل بنے، نہ مفعول۔" (ذکر کلیات اردو مرزا غالب ص۸۸)

یہ لطیفہ محض خیالی ہے اور اِس سے حافظ احمد حسن کی غالب کے بارے میں رائے کا پتا چلتا ہے۔ مولانا ذکاء اللہ البتہ مرزا سے براہِ راست واقف تھے اور مولانا محمد حسین آزاد نے آبِ حیات کے لیے مرزا کے بارے میں جن لوگوں سے رجوع کیا تھا اُن میں وہ بھی تھے لیکن اُن کی

Marfat.com

راے کو مصلحتاً آزاد نے آب حیات میں شامل نہیں کیا۔ اتنی بات میں شبہ نہیں کہ مرزا کو اپنی زبان اور اپنے قلم پر اس اعتبار سے قابو نہیں تھا کہ وہ گالیاں دینے میں بیباک تھے۔ جناب کالیداس گپتا رضا نے بھی اپنے ایک گرامی نامے میں راقم کو لکھا ہے کہ:

"میرے کتبخانے میں غالب کے فارسی کلام کا ایک قلمی نسخہ ہے جو ۱۸۶۱ء سے کچھ پہلے کا مکتوبہ ہے۔ اُس میں مرزا فتح الملک بہادر ولیعہد ظفر کی مدح میں کہا ہوا قصیدہ بھی ہے جس کا دوسرا اور تیسرا شعر یہ ہے ؎

گویند کہ در روزِ اَلَست از رہِ ہستی
حرفے ز لبِ کافر و دیندار بر آمد
آں از نَعَم آوازۂ انکار در افگند
ایں رازِ بَلیٰ معنیِ اقرار بر آمد

اِس کے حاشیے میں غالب کی یہ تحریر اہم ہے:

"چوں ایں قصیدہ شہرت یافت، مولوی امام بخش صہبائی پیشِ معتقدانِ خویش کہ خر کرّۂ چند بودند، گفت افسوس کہ غالب عربی نمی داند و از نَعَم معنیِ انکار افادہ میکند حالانکہ نَعَم و بَلیٰ مرادف بالمعنیٰ است۔ مولوی آلِ نبی یکے از یارانِ غالب عبارتِ شرحِ مُلّا کہ رفعِ ایں وسوسہ میکرد، بوے نمود و گفت، غالب حق گفتہ است و تو غلط فہمیدۂ۔ سوال از جانبِ حق اینست اَلَسْتُ بِرَبِّکُمْ؟ آیا نیستم پروردگارِ شما؟ و ایں کلمۂ استفہامیہ است ..... مولوی چو خر در وَحَل فرو ماند۔"

یہ تحریر غالب کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہے اور میرے یہاں موجود

Marfat.com

ہے۔ رضا"

غالب کی یہ تحریر ہے۔ اِس کی تصدیق کا کوئی ذریعہ اب موجود نہیں ہے۔ غالب کا کہنا ہے کہ مولوی امام بخش صہبائی نے یہ بات مجمع عام میں نہیں بلکہ "پیش معتقدارن خویش" کہی تھی۔ پھر سوال یہ ہے کہ وہاں مرزا اسد اللہ خاں غالب کے دوست مولوی آلِ نبی کس طرح پہنچ گئے؟ غالب نے جس "شرحِ ملاّ" کا ذکر کیا ہے اُس کے بارے میں بھی کوئی بات معلوم نہیں۔ اِنھیں مولوی آلِ نبی کے واسطے سے غالب نے صہبائی کی کم علمی ظاہر کرنے کے لیے ایک اور قصّہ اِس طرح بیان کیا ہے:

"مولوی آلِ نبی سہارنپوری اور مولوی امام بخش دہلوی میں اِس بات پر جھگڑا ہوا۔ مولوی امام بخش "دبا، کو دبے، کہنا جایز نہیں رکھتے تھے۔ آخر مولوی آلِ نبی نے ایمۂ فنِ کلام سے اِس کا جواز ثابت کر دیا مگر صرف از روے تلفظ اور اِس کی اجازت کا کوئی قاعدہ خاص اِس کے واسطے نہیں۔"

(خطوطِ غالب ص ۳۶۴)

مولوی آلِ نبی سہارنپوری کے مبلغِ علم کا حال معلوم نہیں۔ مرزا نے اِس اقتباس میں جن "ایمۂ فن" کا ذکر کیا ہے اُن کے بارے میں بھی کچھ پتا نہیں۔ بظاہر بات اتنی معلوم ہوتی ہے کہ اِس بارے میں مرزا خود کوئی راے دینے سے قاصر تھے۔ اُنھوں نے اپنی بات صہبائی پر ڈال دی۔ حقیقت یہ ہے کہ صہبائی "بے" رے اور فے لکھتے تھے چنانچہ ترجمہ حدایق البلاغت میں بھی ایک جگہ ہے:

Marfat.com

"غبار آکے ترے دل میں پھر نہ نکلا
غبار ہم کو تری طرف سے پھر نہ آیا"

حرفِ آرے اور فے کا مصرع ثانی میں تقطیع سے گر پڑیگا"
(ص ۱۴)

مرزا نے جس "جھگڑے" کا ذکر کیا ہے، وہ محض اُن کے ذہن کی پیداوار ہے۔ اُنھوں نے صہبائی کے بارے میں ایسی بے اصل باتیں اور بھی کہی ہیں، جن کا ذکر آگے آئیگا۔

Marfat.com

گلستانِ سخن

شاہزادہ مرزا قادر بخش صابر نے جو صہبائی کے شاگرد تھے سنہ ۱۲۷۱ھ مطابق ۱۸۵۵ء میں اردو کے شاعروں کا ایک تذکرہ گلستانِ سخن کے نام سے لکھا تھا۔ اُس کے دیباچے میں اُنھوں نے کیفیتِ اس طرح بیان کی ہے:

"اثنائے مشق میں ریختہ گویانِ پیشیں کا کلام کچھ جزودانِ حافظہ میں فراہم ہوتا جاتا اور کچھ گنجینۂ بیاض میں انتظام پاتا تھا..... اِس عرصہ میں سخن سنجانِ عصر کا کلام بھی.... اجزائے علاحدہ میں مخزون اور بیاضِ جداگانہ میں مشحون ہوتا رہا..... ایک مدت کے بعد جو مجموعہ پر نظر کی تو دفتر دفتر سرمایہ فراہم ہو گیا تھا..... فرزند سعادتمند محمد عمر سلطان.... کی تربیت اب پیشِ نہاد ہوئی.... ایک کتاب فراہم کر کے.... جناب افادت مآب مولوی امام بخش صہبائی مدظلہ العالی کی خدمت میں حاضر ہوا..... عرض کیا..... سرانجام اس امرِ دشوار کا کم استعداد سے معلوم، اگر کمترین تلامذہ کی تحریر خلعتِ اصلاح سے مشرف ہو جایا کرے تو یہ مشکل آسان ہو جاوے

Marfat.com

بارے عرض نیاز شعار کی زیورِ قبول سے آراستہ ہوی۔ حلیۂ اجابت سے پیراستہ ہوی۔ (گلستان سخن ۱/ ص۱۷ تا ص۳۶)

صابر نے شرافت کے آداب کو ملحوظ رکھکر انکساری سے کام لیا اور خود کو "کمترین" اور "کم استعداد" لکھدیا۔ اِس بنا پر ستم ظریفوں نے اسے واقعی کمترین[عہ] اور کم استعداد بلکہ بے استعداد اور نااہل قرار دیکر یہ فیصلہ کردیا کہ گلستانِ سخن جیسا ضخیم تذکرہ وہ لکھ ہی نہیں سکتا تھا۔ فاعتبروا یا اولی الابصار۔

تذکرہ گلستانِ سخن پاکستان میں ڈاکٹر وحید قریشی کے مفصل مقدمہ کے ساتھ شایع ہو چکا ہے۔ مقدمہ نگار نے قاضی عبدالودود صاحب سے منسوب کر کے یہ جملہ نقل کیا ہے:

"گلستانِ سخن کے متعلق دہلی کے معتبر اصحاب کا بیان ہے کہ دراصل صہبائی کی تالیف ہے۔"

معلوم نہیں قاضی صاحب نے یہ جملہ کن حالات میں فرمایا تھا۔ بہرحال اِسے قاضی صاحب کی راے کی حیثیت سے تسلیم کرنا راقم کے لیے ممکن نہیں ہے تا وقتیکہ اِس کا مؤید کوی اور بیان نہ ہو۔ راقم نے بہت جستجو کی لیکن اُسے ایک روایت بھی ایسی نہیں ملی جسے واقعی "معتبر" کہا جا سکتا ہو بلکہ اِس افسانے کا سرا بالآخر مرزا اسداللہ خاں غالب تک پہنچتا ہے اور اِس کی بنیاد اُن کی کتاب "قاطعِ برہان" میں ملتی ہے اِس لیے مختصراً اُس کا ذکر ضروری ہے۔

عہ محقق بے بدل قاضی عبدالودود صاحب جو اُردو دنیا کے مدعیانِ کمال کی ذہنیت سے بخوبی واقف تھے فرماتے تھے کہ اپنے لیے کمترین، ہیچمدان وغیرہ الفاظ کبھی نہ لکھو، بلکہ جو کچھ جانتے ہو جہاں موقع ہو اُس کا اظہار بلکہ اعلان کرو۔

Marfat.com

محمد حسین برہان تبریزی کی لُغت جو بقول ڈاکٹر علی اصغر حکمت "بزرگترین فرہنگہاے لغتِ فارسی شمردہ میشود" پر مرزا اسد اللہ خاں غالب نے اپنی کتاب "قاطعِ برہان الملقب بہ درفشِ کاویانی" میں متعدد اعتراض کیے۔ ہمیں معلوم ہے کہ جمہور کے عقیدے کے مطابق شیخ امام بخش صہبائی بھی بُرہان قاطع کو مستند سمجھتے تھے اور اُنھوں نے اپنی تصانیف میں حسب موقع اِس کتاب سے استفادہ بھی کیا تھا مثلاً قولِ فیصل میں ایک جگہ لکھا ہے:

"اقوال در برہانِ قاطع چگل بمعنی گِل و لاے[عہ] و لُچن نیز آوردہ" (قول فیصل ص۷۶)

غالب فنِ لُغت نویسی سے کس درجہ تک واقف تھے، اُنھوں نے قدیم فارسی زبان و ادب کا کس حد تک مطالعہ کیا تھا اور وہ الفاظ کی تحقیق و تدقیق کے لیے کس قدر کھکھیڑ اٹھا سکتے تھے، اِن سب باتوں سے قطع نظر یہ حقیقت ہے کہ اُنھوں نے برہانِ قاطع کے مؤلف کے لیے سخت ترین کلمات استعمال کیے ہیں۔ قاطعِ بُرہان کی تالیف کے وقت اُنھوں نے ہر اُس شخص کو ہدفِ ملامت بنایا ہے جو بُرہانِ قاطع کا مؤید تھا۔ شیخ امام بخش صہبائی اگرچہ اِس سے پہلے اللہ کو پیارے ہو چکے تھے، مرزا نے اُن کو بھی نہیں چھوڑا۔

قاطعِ بُرہان کے معرکے میں حصہ لینے کے لیے صہبائی تو موجود نہیں تھے لیکن اُن کے ایک شاگرد مرزا عبدالرحیم بیگ میرٹھی نے ساطعِ برہان کے نام سے ایک رسالہ لکھکر شایع کیا اور نتیجہ کے طور پر غالب سے خود بھی بہت کچھ سنا اور اپنے مرحوم استاد کے لیے بھی بہت کچھ کہلوایا

عہ لاے = دُردِ شراب اور لُچّن = زنِ قحبہ

Marfat.com

قاطعِ بُرہان پہلی بار ۱۲۷۶ھ مطابق ۶۰-۱۸۵۹ء میں مکمل ہوی تھی اُس کے تین برس بعد ساطعِ برہان وجود میں آی۔ بعد میں جب مرزا نے اپنی مذکورہ کتاب پر نظرِ ثانی کی تو اُس میں رحیم بیگ کی کتاب ساطعِ برہان کے ذکر کو بھی شامل کیا۔ مثلاً

"آہ از عبدالرحیم بیگ کہ در ساطعِ برہان ایں ہفت فاضلِ جلیل القدر را کار پردازانِ مطبع نام نہادہ اند۔ من ہیچ نمی گویم امّا سعدی را چہ کنم کہ می گوید شعر

سگِ بدگوہر اگر کاسۂ زرّین شکند
قیمت سنگ نیفزاید و زر کم نہ شود"

(قاطعِ برہان ص۳۴)

ساطعِ بُرہان کے علاوہ اِس معرکے سے متعلق بعض دوسری کتابوں مثلاً محرقِ قاطع، دافعِ ہذیان، مؤیدِ بُرہان وغیرہ کا ذکر بھی قاطعِ بُرہان کی جدید اشاعت میں شامل ہے۔ قاطعِ بُرہان کا "دیباچہ ثانی" لکھتے وقت مرزا غالب نے اِس کتاب میں شیخ امام بخش صہبائی سے متعلق بعض اشارے شامل کر دیے ہیں۔ مثال کے طور پر:

"ہم ایں معلّم ادّعاے آں داشت کہ شفق بہ صبح نسبت ندارد آں فلق است و شفق بہ شام مخصوص۔ دیگر آں ہمی سرود کہ درمیانِ اسم و صیغۂ امر کہ بمعنی فاعل آرند الفاظِ دگر گنجایش نمی پذیرد۔ یارب مطلعِ خاقانِ قلمرو سخن خاقانیِ شروانی را تاویل چیست؟ شعر

صبح دم چوں کلبہ بندد آہ دود آساے من
چوں شفق در خوں نشیند چشم شب پیماے من

و ہمچنیں مصرع محمد سعید اشرف ماثر ندرانی را کہ بے تاویل

پذیرفتنی است، یا سخن کجاست ؎

"چو صبحِ شفق آلودہ رخش سرخ و سفید"

(قاطع برہان ص۱۵۷)

مرزا غالب نے اپنی اِسی بات کو نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ کے نام ایک خط میں بھی اِس طرح لکھا ہے:

"صہبائی شفقِ صبح کو غلط اور اِس رنگ کو مخصوص بہ شام جانتا تھا۔ محمد سعید اشرف مازندرانی کے کلام میں نظر پڑا۔

مصرع "چو صبحِ شفق آلودہ رخش سرخ و سفید"

(عودِ ہندی ص۱۶۷)

شیفتہ کے نام کے اِس خط سے یہ بات متیقن ہو جاتی ہے کہ قاطعِ برہان کے مذکورہ اقتباس میں بھی "ایں معلّم" سے مرزا کا اشارہ صہبائی ہی کی طرف تھا۔ صہبائی کو معلّم کہکر مطعون کرنے میں اُس احساس کا اثر بھی صاف جھلکتا ہے جو کسی وجہ سے اُس منصب سے محروم رہ جانے کے سبب مرزا کے ذہن پر موجود تھا۔ یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ بقول مولانا محمد حسین آزاد اِس منصب کو وہ "باعثِ زیادتیِ اعزاز" سمجھتے تھے۔

مرزا نے کہیں یہ نہیں بتایا کہ صہبائی نے شفق کو کہاں اور کس پس منظر میں "مخصوص بہ شام" کہا تھا۔ جب تک سیاق و سباق کا علم نہ ہو یہ کوئی حکم لگانا صحیح نہیں۔ محض مرزا کے قول پر اعتماد کرکے یہ سمجھ لینا کہ صہبائی نے واقعی ایسا کہا ہوگا صحیح نہیں ہو سکتا۔

عہ مرزا اِس نکتے کو پا گئے تھے کہ بات کو بار بار کہو، آخر تمھاری بات "معتبر" ہو کر ہی جا ئیگی۔

Marfat.com

قاطع برہان میں مرزا اسداللہ خاں غالب نے ذیل کے اقتباس میں بھی صہبائی کی طرف اشارہ کیا ہے:

"یکے از معاصرین کہ معلّمی پیشہ داشت، بے خرداں را بپارسی دانیِ خویش فریفتے و دید و دانست خود را بہ بہائے گراں فروختے۔ خویشتاب و ژندہ رود فراچنگ آورد۔۔۔ مولوی در تصنیفاتِ خود آں ہر دو صحیفہ را نام می برد و بہ تبحرِ خویش در پارسی دانی ازیں ادا بر مردم عرضہ می داد، نامہ نگار آں ہر دو نگارش دیدہ است۔ سراسر در گیرندہ بغوامض کیش و ملت است نہ راہ نمایندہ بقواعد نطق و تقریر" (قاطع برہان ص ۱۵۶)

اِس اقتباس میں غالب کا یہ کہنا کہ صہبائی خود کو "بہ بہائے گراں" فروخت کرتے تھے لایقِ توجہ ہے۔ یہ کام غالب نہ کر سکے۔ اُنھیں اِس کی حسرت رہ گئی اور اسی حسرت نے اُنھیں حسد میں مبتلا کر رکھا تھا۔ غالب کا دعوا ہے کہ صہبائی نے اپنی "تصنیفات" میں مذکورہ دونوں کتابوں کا نام فخریہ لیا ہے لیکن اُن کے دوسرے دعووں کی طرح یہ بھی بے اصل ہے چنانچہ ڈاکٹر وحید قریشی نے لکھا ہے:

"صہبائی کی کسی کتاب میں جو اُن کے نام سے چھپی ہیں اور میری نظر سے گذری ہیں، اِن کتابوں کا ذکر نہیں اور غالب نے گلستانِ سخن ہی کو دیکھ کر قاطعِ برہان میں اُن پر الزام لگایا ہے۔" (گلستانِ سخن، مقدمہ ۱/ حاشیہ ص ۱۰۷)

اور گلستانِ سخن کے مصنف نے بھی اِن کا ذکر فخریہ نہیں کیا ہے۔ ڈاکٹر خواجہ محمد حامد کا بیان ہے کہ:

"مقدمۂ گلستانِ سخن کے علاوہ اِن کتابوں کا ذکر کہیں نہیں

Marfat.com

کیا ہے اور ذکر بھی فخریہ نہیں۔ نیز یہ بھی ظاہر نہیں ہوتا کہ وہ اِن کے مطالعے کا ذکر کر کے لوگوں کو مرعوب کرنا چاہتے ہیں"۔ (امام بخش صہبائی ص۸۵)

بظاہر اِس بحث کا سلسلہ اس طرح معلوم ہوتا ہے کہ قاطع برہان میں لکھنے سے پہلے مرزا غالب نے خوشتاب دبیر کے فخریہ ذکر کرنے کا الزام صہبائی پہ لگایا ہوگا اور اُن سے اِس کے لیے صہبائی کی کسی تحریر سے سند طلب کی گئی ہوگی۔ چونکہ اِن دونوں کتابوں کا ذکر گلستانِ سخن میں موجود تھا اپنے دعوے کی تائید کے لیے اُنھوں نے گلستانِ سخن کو صہبائی سے منسوب کرنا شروع کر دیا۔ مرزا ذہین آدمی تھے۔ زمانے کی ہوا کو اچھی طرح پہچانتے تھے اور اُس سے فایدہ اُٹھا لینا بھی جانتے تھے۔ اُنھیں معلوم تھا کہ غدر کے فوراً بعد شاہزادہ مرزا فادر بخش صابر باغدر میں شہید کیے جانے والے شیخ امام بخش صہبائی کی حمایت میں کسی شخص کے لیے بھی زبان کھولنا آسان نہیں تھا اِس لیے اِن کے بارے میں جو بھی کہدیا جائیگا زمانہ مابعد میں اُسے "معتبر" تسلیم کر لیا جائیگا۔ چنانچہ اُنھوں نے انوار الدولہ شفق کے نام ایک خط میں لکھا:

"صہبائی کے تذکرے کی ایک جلد میری ملک میں سے میرے پاس تھی وہ میں اپنی طرف سے بہ سبیلِ ارمغان آپ کو بھیجتا ہوں۔ نذر قبول ہو"

(خطوطِ غالب ص۱۹۷)

اگرچہ یقین کے ساتھ یہ نہیں معلوم کہ غالب نے کون سی کتاب بھیجی تھی عام طور سے خیال کیا گیا ہے کہ اُنھوں نے تذکرہ گلستانِ سخن ہی بھیجا تھا۔ بظاہر اُنھوں نے صہبائی کے "انتخابِ دواوین" کو تذکرہ نہ کہا ہوگا۔ شفق نے غالب کے بیان پہ لازماً اعتماد کیا ہوگا اور جو کتاب

Marfat.com

اُن کے پاس بھی ہوگی اسے صہبائی ہی کی تصنیف مان لیا ہوگا۔

مرزا عبدالرحیم بیگ کی کتاب کی اشاعت کے بعد غالب شیخ امام بخش صہبائی کی مخالفت میں بہت شدید ہو گیے تھے اور اُن کو طرح طرح سے مطعون کرنے لگے تھے۔ مولوی عبدالرزاق شاکر کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

"نامۂ غالب کا مکتوب الیہ رحیم بیگ نامی میرٹھ کا رہنے والا دس برس سے اندھا ہو گیا ہے۔ کتاب پڑھ نہیں سکتا، سُن لیتا ہے۔ عبارت لکھ نہیں سکتا، لکھوا دیتا ہے بلکہ اُس کے ہموطن ایسا کہتے ہیں کہ وہ قوت علمی بھی نہیں رکھتا، اور دل سے مدد لیتا ہے۔ اہل دہلی کہتے ہیں کہ مولوی امام بخش صہبائی سے اُس کو تلمذ نہیں ہے۔ اپنا اعتبار بڑھانے کو اُن کا شاگرد بتاتا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ وائے اُس ریچ پوچ پر جس کو صہبائی کا تلمذ موجب عزّ و وقار ہو۔ رسالہ اُس کا ساطع برہان دہلی پہنچکر ڈھونڈھونگا۔ اگر مل گیا تو خدمت میں پہنچیگا"

(عود ہندی ص۱۵۲)

یہ اُس وقت کے سیاسی حالات ہی کا اثر تھا کہ باوجودیکہ صہبائی کے شاگردوں کی بڑی تعداد موجود تھی اور اُن میں سے بیشتر اچھے مناصب پر فایز تھے، صہبائی کے بارے میں مرزا سب ہی کچھ لکھتے رہے اور کسی نے بھی زبان نہ کھولی۔

غالب نے مرزا عبدالرحیم بیگ کے بارے میں اقتباسِ بالا میں جو کہا ہے اُسی سے ظاہر ہے کہ وہ شخص کیا صاحب علم اور[ع] صاحب استعداد ہوگا

ع۔ لالہ سریرام نے لکھا ہے: (بقیہ اگلے صفحہ پر)

Marfat.com

جو غالب کی کتاب کو دیکھے بغیر، محض سُنکر، اُس کا ایسا جواب لکھوا سکتا تھا کہ "نامۂ غالب" چھپوا دینے کے بعد بھی غالب کو چین نہ پڑ سکا۔ رہی اُس کے تلمیذِ صہبائی کی بات، تو اِس کے لیے خود مرزا غالب ہی کی شہادت موجود ہے کہ:

"رحیم بیگ کا اصل وطن سردھنہ ہے اور فی الحال میرٹھ میں مقیم اور معلمی اُس کا پیشہ ہے۔ وہ آٹھ دس برس سے اندھا، نظم و نثر میں مولوی امام بخش صہبائی کا شاگرد اور فارسی شعر کہتا ہے۔" (بحوالہ غالب از مہر ص۴۵۷)

غالب کے اِن دونوں بیانوں کا فرق ظاہر ہے۔ مرزا قادر بخش صابر نے بھی مرزا رحیم بیگ کو صہبائی کے شاگردوں میں شمار کیا ہے اور لکھا ہے کہ اُس نے صہبائی سے چند کتابیں پڑھی تھیں۔ شاگرد کے نام خط میں، جو اوپر نقل ہوا، اُن "اہلِ دہلی" سے جو غالب سے یہ کہتے تھے کہ "اپنا اعتبار بڑھانے کو" رحیم بیگ خود کو صہبائی کا شاگرد بتاتا ہے، غالب کے سوا

(بقیہ صفحہ گذشتہ)

"رحیم مرزا رحیم بیگ شاہجہاں آبادی الاصل، ولد میرزا امیر بیگ سردھنے میں رہتے تھے ..... پہلے شرر تخلص تھا۔ ۱۲۷۱ھ میں حسب فرمائش حکیم احسن اللہ خاں قصص الانبیا کو نظم کیا تھا۔" (مخزنہ ص۳۷۴)

عبدالغفور خاں نساخ نے بھی اِن کی ایک کتاب کا ذکر کیا ہے۔ لکھا ہے:

"مخزن الشعرا اِن کا نظر سے گذرا۔" (سخن شعرا ص۱۸)

اِن اقتباسوں سے ظاہر ہے کہ مرزا رحیم بیگ بارسوخ اور صاحب تصانیف تھے۔ غالب نے اور باتوں کے علاوہ اِن کے "شاہجہان آبادی الاصل" ہونے پر بھی پردہ ڈالنے کی کوشش کی ہے۔

Marfat.com

کوئی دوسرا نہیں تھا۔

مرزا قادر بخش صابر کے تذکرے کے بارے میں سب سے پہلے ڈپٹی عبدالغفور خاں نساخ کے تذکرے "قطعۂ منتخب" میں یہ بات آئی ہے کہ:

"صابر مرزا قادر بخش..... تذکرہ گلستانِ سخن ان کے نام سے مشہور ہے لیکن حقیقت میں تذکرۂ مذکور مولوی امام بخش صہبائی کا لکھا ہوا ہے کہ عبارت اِس کی اِس بات پر گواہی دیتی ہے"
(قطعۂ منتخب ص۴۲)

پھر لفظوں کے کسی قدر فرق کے ساتھ یہی بات نساخ نے اپنے دوسرے تذکرے میں اِس طرح نقل کی کہ:

"صابر تخلص مرزا قادر بخش..... تذکرہ گلستان سخن اِن کے نام سے مشہور ہے لیکن حقیقت میں تذکرۂ مذکور مولوی امام بخش مرحوم کا لکھا ہوا ہے" (سخن شعراء ص۲۷۲)

نساخ کلکتہ کے رہنے والے تھے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ "حقیقت" اُن پر سب سے پہلے کس طرح آشکار ہوئی؟ صہبائی کے ساتھ اُن کے براہِ راست کوئی مراسم نہیں تھے کہ یہ بات اُنھیں خود صہبائی نے بتلائی ہوتی، صابر اور اُن کے متعلقین اُن سے یہ بات کہہ نہیں سکتے تھے۔ البتہ مرزا اسداللہ خاں غالب نساخ کے مداح تھے اور دونوں کے مابین مراسلت بھی تھی۔ قوی امکان ہے کہ یہ بات نساخ تک غالب ہی نے پہنچائی تھی۔ پہلے تذکرے

عہ نساخ کی ایک سے زاید تصانیف نثر و نظم مختلف اساتذہ کے طرز میں تھیں، اُن کی عبارت کی گواہی" پر اُن سب کو نساخ کے بجائے اُن اساتذہ کی تصنیف قرار دینے پر خود نساخ سخت احتجاج کرتے لیکن افسوس ہے کہ دوسرے کے ساتھ اِس ظلم کو اُنھوں نے روا رکھا۔

Marfat.com

ہیں نساخ نے "عبارت" کی گواہی پیش کر کے اپنی تحریر کو مدلل بنانے کی کوشش کی تھی۔ ممکن ہے کہ ایسا لکھنے کی انھیں ہدایت ملی ہو۔

دہلی والوں میں یہ بات شاید سب سے پہلے شاہ بشیر الدین بشیر معروف بہ عبداللہ شاہ نے جو شاہ نصیر دہلوی کے چھوٹے صاحبزادے شاہ نجم الدین کے حقیقی نواسے تھے، اپنے تذکرے میں لکھی تھی۔ یہ بشیر ۶ شوال ۱۲۶۶ھ مطابق ۵ اگست ۱۸۵۰ء کو پیدا ہوئے تھے۔ صہبائی کے علمی مشاغل سے ان کے براہِ راست واقف ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ صہبائی کے بیشتر اخلاف اور اہلِ خاندان، اُن کے ساتھ ہی اللہ کو پیارے ہو گئے تھے۔ اس لیے بشیر کے دہلوی ہونے کو اس معاملے میں کوئی اہمیت نہیں رہ جاتی۔ یہ مسلّم ہے کہ نساخ کے تذکرے سے انھوں نے استفادہ کیا تھا اور سخنِ شعرا کو تذکرۂ بشیر کے اہم ترین ماخذ میں شمار کیا گیا ہے۔ بشیر نے اپنے تذکرے میں گلستانِ سخن سے متعلق یہ تمہیدی الفاظ وہی لکھے یا جو نساخ لکھ چکے تھے یعنی:

"گلستانِ سخن سنہ ۱۲۷۱ھ مرزا صاحب کے نام سے مشہور ہے مگر درحقیقت مولوی صہبائی کی تصنیف ہے، اس میں فارسی، اردو دونوں زبانوں کے شاعروں کا حال و مقال مندرج ہے"۔

(بحوالہ مقدمہ گلستانِ سخن ۱/ص ۱۷)

اس تذکرے میں دوسرے مقام پر نساخ کے پہلے تذکرے کا قطعہ منتخب کی عبارت بھی تھوڑی سے فرق کے ساتھ اس طرح نقل ہوئی ہے:

"گلستانِ سخن سنہ ۱۲۷۱ھ صاحب عالم مرزا قادر بخش صابر کے نام سے مشہور ہے مگر حقیقت میں اُن کے استاد مولوی امام بخش صہبائی جنت مکانی کی تصنیف ہے۔ اس کی عبارتیں اس بات کی شاہد ہیں اور اس شہر کے خاص

Marfat.com

خاص خاص اشخاص کو یہ حال معلوم ہے۔" (حوالہ ایضاً ص ۱۸۴)

کس قدر حیرت کی بات ہے کہ شہر دہلی میں ایسے "خاص خاص لوگ" جو گلستانِ سخن کی حقیقت کے جاننے والے تھے صہبائی کی شہادت کے کئی برس بعد اور بشیر کے معاصر پیدا ہوئے تھے لیکن وہ بھی ایسے تھے کہ ان میں سے ایک کا نام لینا بھی بشیر کے لیے ممکن یا مناسب نہیں تھا۔

شمس العلما مولانا محمد ذکاء اللہ کے "رسالۂ تذکرات" کے حاشیہ پر بھی دو مختلف جگہوں پر کسی نامعلوم شخص نے تذکرۂ بشیر کے مذکورہ دونوں اقتباس لفظ بہ لفظ نقل کر دیے ہیں اور یوں اس باب میں ایک روایت کا اور اضافہ ہو گیا۔ اس طرح وہ بات جو مرزا غالب نے شروع کی تھی چل پڑی۔ لیکن یہ امر خاص طور سے توجہ طلب ہے کہ خود شمس العلما مولانا ذکاء اللہ نے یا فرانسیسی مستشرق گارسن دتاسی نے یہ بات کہیں نہیں کہی ہے۔

گلستانِ سخن کا پہلا ایڈیشن ۱۲۷۱ھ مطابق ۱۸۵۵ء میں مطبع مرتضوی دہلی سے حافظ محمد غیاث الدین کے اہتمام سے چھپا تھا۔ اس میں شیخ امام بخش صہبائی کے صاحبزادے مولوی عبدالکریم سوز کا کہا ہوا خط بہ تاریخ

عہ گارسن نے دسمبر ۱۸۵۴ء کے اپنے خطبے میں گلستانِ سخن کا نام لیا تھا، پھر دسمبر ۱۸۵۵ء کے اپنے خطبے میں اس کا ذکر تفصیل سے کیا ہے اور لکھا ہے:

"میں ایک ایسے تذکرے کا حال آپ کو سناتا ہوں۔ اس تذکرے کا نام گلستانِ سخن ہے۔ اس کے مصنف مرزا قادر بخش المتخلص بہ صابر ہیں جو خاندانِ شاہی کے ایک شہزادے مرزا مکرم بخت کے لڑکے ہیں..... صابر مولوی امام بخش صہبائی کے شاگرد ہیں جو آج کل کے اعلا درجے کے ہندوستانی مصنفین میں سے ہیں۔"

Marfat.com

اِس طرح چھپا تھا:

قطعۂ تاریخ گفتۂ عبدالکریم سوز

از کلکِ صابر ایں دُرِ شہوارِ برتری — در سلکِ انتظام بصد زیب سُفتہ اند
سوزِ حزیں چو کرد تأمل بہ جیبِ فکر — معیارِ فطرت و ہنرش سال گفتہ شد

۱۲۷۱ھ

صہبائی کے عزیز شاگرد منشی دین دیال کی تحریک سے تذکرہ گلستانِ سخن مطبع نولکشور سے اپریل ۱۸۸۳ء مطابق جمادی اول ۱۲۹۹ھ میں چھپکر شایع ہوا۔ منشی دین دیال کی استاد پرستی نے اِس کے سرورق پر اُن سے یہ عبارت لکھوالی:

"باصلاحِ عباراتِ استادِ کامل مولوی امام بخش صہبائی"

لیکن صہبائی کے بیٹے اور اُن کے اُستاد پرست شاگرد نے بھی یہ دعوا نہیں کیا کہ یہ تذکرہ کُل یا اس کا کوئی جُزو صہبائی کا لکھا ہوا ہے۔ حقیقتِ حال سے اِن سے زیادہ کوئی شخص نہیں ہو سکتا تھا۔ استاد بھائی ہونے کی حیثیت سے مُنشی دین دیال کو مرزا قادر بخش صابر بھی عزیز تھے۔ اُن کی اِس محبت نے اُنھیں مجبور کیا تھا کہ وہ صابر کے تذکرے کو دوبارہ چھپوا دیں۔ سرورق پر مذکورہ عبارت کے لکھوانے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ خصوصاً جبکہ خود صابر نے استاد کی اصلاحات کا پوری صراحت کے ساتھ تذکرے کے مقدمے میں اعتراف کر لیا تھا۔ اِس عبارت کے لکھوانے سے مقصود بظاہر اِس کے سوا کچھ نہیں تھا کہ افترا پردازوں کی تکذیب کر کے فتنہ کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا جائے لیکن افسوس ہے کہ لالہ سری رام نے اِس صریحی عبارت کو نظر انداز کر کے نساخ اور بشیر کے تذکروں کے اندراج پر اعتماد کر لیا اور خود بھی خمخانۂ جاوید کی پہلی جلد کے دیباچے میں یہ لکھدیا کہ:

Marfat.com

"گلستانِ سخن نے جس کی تدوین مولانا امام بخش صہبائیؒ نے کی اور مرزا قادر بخش صابر نے اپنے نام سے چھپوایا دہلی سے آگے قدم بڑھانے کو عار سمجھا۔"

یہاں پر یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ لالہ سری رام نے غلط لکھا۔ گلستانِ سخن کو ایک بار بھی صابر نے نہیں چھپوایا تھا بلکہ جیسا کہ عرض کیا گیا۔ پہلی بار وہ حافظ محمد غیاث الدین کے اہتمام سے چھپا تھا اور دوسری بار منشی دین دیال کی تحریک پر چھپا تھا۔ چنانچہ صحیح وہی ہے جو لالہ سری رام کے تذکرے کی پانچویں جلد میں ہے کہ:

"صاحب علم مرزا قادر بخش گورگانی ..... گلستانِ سخن ایک تذکرۂ شعرا بھی آپ نے لکھا تھا" (خمخانہ ۵/ صفحہ ۲۲۷)

صابر، سوز، حافظ محمد غیاث الدین اور منشی دین دیال وغیرہ کو جھٹلانے کے لیے کوئی وجہ موجود نہیں ہے۔ اِن کے بیانات میں تصنع بھی نہیں ہے اِس لیے گلستانِ سخن کے صابر کی تالیف ہونے پر شبہ بھی نہیں کیا جا سکتا۔

ڈاکٹر وحید قریشی نے گلستانِ سخن کا بالاستیعاب مطالعہ کیا ہے۔ اُنھوں نے اِس تذکرے کے مندرجات کا مقابلہ صہبائی کے انتخابِ دواوین سے کرنے کے بعد نتیجہ کے طور پر لکھا ہے:

"تذکرے کا اصل متن جس میں شاعروں کا حال ہے تحریر کے وقت تک کئی مرحلوں سے گذر چکا تھا اور اِس کا ابتدائی خاکہ گمانِ غالب ہے کہ صابر ہی کا تیار کردہ ہے۔ نظرِ ثانی میں کہیں کہیں استاد صہبائی نے ترمیم کی ہو تو عجب نہیں ورنہ اِن شعرائے اردو کے بارے میں صابر اور صہبائی کے خیالات میں بیّن فرق موجود ہے۔ انتخابِ دواوین میں صہبائی نے بعض معاصر شاعروں کو بھی شامل کیا ہے اور اُن کے حالات لکھ کر کلام

Marfat.com

کے بارے میں اپنی راے دی ہے۔ یہ راے صابر کی درج کردہ آرا سے مختلف ہے۔"

(گلستانِ سخن، مقدمہ ۱/ ص۷۶)

اپنی اِس بحث کو آگے بڑھاتے ہوے ڈاکٹر موصوف نے یہ بھی لکھا ہے کہ:

"گلستانِ سخن کے یہ اقتباسات شعرا کے بارے میں زیادہ تفصیلی اور گہری معلومات کے علاوہ انتخابِ دواوین کی بیان کردہ آرا سے مختلف بھی ہیں۔ خصوصاً ممنون اور ناسخ کے بارے میں جن خیالات کا اضافہ ہوا ہے وہ صہبائی کے مقابلے میں زیادہ وقیع ہیں اور اُس بدلے ہوے ذوق کی نمایندگی کرتے ہیں جو صابر اور اُسی عمر کے بعض دوسرے نقادانِ فن کے ہاں جلوہ گر ہیں۔" (ایضاً ۱/ ص۱۰۱)

راقم کے علم میں ۱۲۷۱ھ کے ایک سال کے اِدھر اُدھر کا کوئی ایسا تذکرہ نہیں ہے جو دہلی میں تصنیف کیا گیا ہو، اور ڈاکٹر وحید قریشی نے بھی اُس کا ذکر نہیں کیا ہے؛ اِس لیے صابر کے تذکرے کے زمانے کے دوسرے "نقادانِ فن" کی تحریروں سے مقابلے کرنے اور مذکورہ راے کی صحت یا عدمِ صحت کے بارے میں کچھ عرض کرنے سے قاصر ہے۔ ایک بدیہی حقیقت البتہ یہ ہے کہ اگر صہبائی نے گلستانِ سخن کو "الف سے ی تک ایک بار پڑھ بھی لیا ہوتا کہ تو اِس میں خود اُن کے ذکر میں وہ غلطی باقی نہیں رہ سکتی تھی جو اُن کے رسالہ وافی اور رسالہ کافی سے متعلق ہے اور جس کی حسب موقع نشاندہی کی جا چکی ہے۔ پھر صہبائی اگر خود اپنے حالات لکھتے تو مدرسۂ شاہجہاں آباد کی ملازمت کے علاوہ اردو زبان میں اپنی کتابوں کا بھی ذکر ضرور کرتے، خصوصاً اس لیے کہ یہ تذکرہ اردو گویوں کا ہے اور اردو زبان میں لکھا گیا ہے۔ گلستانِ سخن میں صہبائی کے اُردو شعروں کا بھی ذکر ہو سکتا تھا اپنے بیٹوں، بھتیجوں

Marfat.com

اور عزیزوں کے بارے میں بھی صہبائی زیادہ بہتر معلومات قلمبند کر سکتے تھے۔ اُن کے دوستوں کے ذکر میں بھی کوئی جملہ کوئی فقرہ یا کوئی لفظ ایسا ضرور مل جاتا جس سے صہبائی کے اِس تذکرے میں دخل و تصرف کا ثبوت حاصل ہو جاتا۔ یہ سب ایسی باتیں ہیں جو نہ صرف اِس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ یہ تذکرہ صہبائی نے نہیں لکھا بلکہ اِس حقیقت کی بھی غمازی کرتی ہیں کہ صابر کے اعتراف اور اظہار کے باوجود اِس تذکرے کے بُرے حصے کو صہبائی نے دیکھنا ضروری یا مناسب بھی نہیں سمجھا اور صابر نے جو کچھ اور جیسا کچھ لکھا تھا وہی بجنسہٖ چھپ کر شائع ہوا۔

تذکرہ گلستانِ سخن کے بارے میں دلچسپ بات یہ ہے کہ شاعروں کے حالات کو بقلم صابر ماننے کے باوجود ڈاکٹر وحید قریشی نے لکھا ہے:

"گلستانِ سخن کے ابتدائی دو سو تین صفحات میں جو بحثیں اٹھائی گئی ہیں وہ صہبائی کے سوا کوئی دوسرا نہیں کر سکتا۔"

(گلستانِ سخن، مقدمہ ۱/ ۴۸)

مجھے معلوم نہیں کہ دوسرا شخص وہ بحثیں آخر کیوں نہیں کر سکتا تھا؟ صابر صہبائی کے شاگرد تھے۔ اُنھوں نے صہبائی کی کتابیں پڑھی تھیں اُن سے براہِ راست تعلیم پائی تھی۔ اِس تذکرے کی تکمیل میں بھی اُن سے مشورے کیے تھے۔ اِس کے باوجود جن موضوعات پر صہبائی بحثیں کر سکتے تھے، اُن کو صابر قلمبند نہیں کر سکتے تھے۔ یہ ایسی بات ہے جس پر ع

ناطقہ سر بگریباں کہ اسے کیا کہیے

مرزا قادر بخش صابر نے تذکرہ گلستانِ سخن میں اپنے استاد شیخ

Marfat.com

امام بخش صہبائی کی دل کھول کر ستائش کی ہے لیکن افسوس ہے کہ اُنھوں نے نہ تو صہبائی کے والدین کے بارے میں کوئی اطلاع دی، نہ صہبائی کے سوانحات سے متعلق کچھ لکھا اور نہ اُن کی تصانیف کی فہرست ہی درج کی ہے۔ یہ بھی نہیں بتایا کہ وہ اردو میں شعر کہتے تھے یا نہیں۔ ہاں وہ اپنے استاد کی فضیلتِ علمی کے نہایت معترف تھے اور اپنے تذکرے میں اِسی کا ذکر اُنھوں نے تفصیل سے کیا ہے:

"باطِ ہستی پر اِس جامعیت کے ساتھ کم کسی نے قدم رکھا ہے۔ سخن اِس مجمعِ فضایل کی قدر شناسی پر کیونکر نازنہ کرے کہ نکاتِ معنی و حقایقِ بیان و محسناتِ بدیعی و تحقیقاتِ نحات و تفتیشِ مصطلحات و تجسّسِ اوزانِ عروض و تشخیصِ احوالِ قوافی جس تفصیل سے یہاں محقق ہیں و عویدانِ کمال سے کس کے خزانۂ طبع میں مشاہدہ ہوئے ہیں؛ صناعتِ عروض میں تلاشِ اوزان کی ایسی داد دی ہے کہ خلیل ابن احمد دیارِ عرب میں اور مولانا یوسف گلزمینِ عجم میں اگر اب موجود ہوتے تو تحقیقِ حقایق و تدقیقِ دقایق کے ارادے سے سفرِ ہند پہ کمر باندھتے ..... اور انواعِ کلام اور اصنافِ سخن کی کثرت کا تو کیا بیان کیجیے کہ صندوقِ سینۂ افلاک میں گنجایشِ پذیرائی نہیں۔ اِس تذکرہ میں چند ابیاتِ غزل اور کچھ اشعارِ قصیدہ اور بعضے نظمِ معمّا نمونتاً درقلم کرتا ہوں تاکہ اربابِ فہم و فراست پر واضح ہو جاوے کہ اِس کے سوا جو سخن ہے اُبکے کے ارشادات بلکہ حیوانانِ عجم کے اصوات کی قبیل سے ہے۔"

مرزا قادر بخش صابر نے گلستانِ سخن میں اپنے استاد

Marfat.com

صہبائی کے متعدد شاگردوں کا بھی ذکر کیا ہے لیکن اُن کے حالات سے بھی صہبائی کے بارے میں کوئی خاص معلومات حاصل نہیں ہوتیں۔ بعض کا تذکرہ گذشتہ اوراق میں کیا جا چکا ہے۔ باقی کے نام اور تخلص یہ ہے

آہی میر عبدالرحمٰن	اثر عبدالرزاق
اوج لالہ جگل کشور	ایجاد مرزا رحیم الدین
بسمل نواب امیر حسن خاں	بلبل پنڈت گوری شنکر
تمنا عبدالرحمان	حسرت متولال
حیرت حافظ عبدالرحمان	رحیم مرزا عبدالرحیم بیگ
زار امام بخش ٹھانیسری (نابینا)	سحر احمد علی
شرر منسارام	شفقت میر محمد حسین
شوق حکیم عنایت اللہ فرید آبادی	شیدائی وحسن ابوالحسن
شیدائی مرزا رمضانی بیگ	عالی میر لدی امیر علی
عیش رائے عزت سنگھ	غریب غریب اللہ
فدا مرزا بلند بخت	فروغ محمد عمر سلطان
فغاں لال جی پرشاد پنڈت	قلق سلطان خاں
محوی محمد بیگ	نورحق شاہ محمد جمیل دہلوی

اِن چند کے علاوہ شیخ امام بخش صہبائی کے اور بھی بہت شاگرد تھے لیکن صرف بعض کے بارے میں مختلف ماخذ سے معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ لالہ سریرام نے اپنے تذکرے میں ضمناً لکھا ہے:

"مولانا فیض الحسن خیال سہارنپوری کے باشندے ....
سُنا ہے کہ ..... حضرت صہبائی کے نامور تلامذہ میں تھے"

(خمخانہ ۳/ص ۶۵۱)

تذکرہ صبح گلشن میں ارشاد احمد محوی متخلص ابن شیخ عبدالقادر کو

Marfat.com

اور صہبائی کے رسالے قولِ فیصل کی تقریظ میں پنڈت دھرم نارائن نے پنڈت ہرنرائن وکیلِ سرکار جاورہ کو صہبائی کا شاگرد بتایا ہے۔ اِسی طرح امیر مینائی نے بھی اپنے تذکرے میں لکھا ہے:

"قاصر حافظ علی احسن ابن حکیم سید محمد قوم مغل، اڑتالیس برس کی عمر ... فارسی میں پہلے مولوی نصیر الدین خاں صابر سے تلمذ ہوا۔ پھر مولوی امام بخش صہبائی سے مشورہ رہا۔"

(انتخاب یادگار ص۲۹۹)

رسالہ پیام یار لکھنؤ کے جون ۱۸۸۵ء کے شمارے میں جناب محمد جعفر صاحب ساقی گویا مولوی شاگرد جناب صہبائی مرحوم کی ایک غزل شائع ہوئی تھی جس کا مطلع یہ ہے ؎

کیا کریں جب وہ بیوفا نہ سُنے ۔۔۔ شکوہ کیا اُس کا جو گلا نہ سُنے

دہلی کالج میں اور اُس کے باہر ذاتی طور سے جن لوگوں نے فارسی پڑھی تھی، اُن کا شمار کرنا نہ جب آسان تھا اور نہ اب ممکن ہے۔ مرزا فتح اللہ بیگ نے صحیح لکھا ہے:

"اِن کی علمیت کا ڈنکا تمام ہندوستان میں بج رہا ہے ایسے جامع الکمال آدمی کہاں پیدا ہوتے ہیں۔ ہزاروں شاگرد ہیں۔ اکثر ریختہ کہتے ہیں۔ اُن کو اصلاح دیتے ہیں اور خوب دیتے ہیں مگر خود اُن کا کلام تمام و کمال فارسی ہے۔ میں نے تو ریختے میں نہ کبھی اُن کی کوئی غزل دیکھی اور نہ سنی" (دلّی کی آخری شمع ص۱۱۴)

صہبائی کی اردو شاعری کا حال درج کیا جا چکا۔ مولانا محمد حسین آزاد نے دیوانِ ذوق میں ایسے واقعات نقل کیے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ اردو کے مشاعروں میں شرکت کرتے تھے مثلاً ایک مشاعرے

Marfat.com

کا ذکر کرتے ہوئے جس میں ذوق نے اپنی وہ مشہور غزل پڑھی تھی جس کا مصرعِ اول یہ ہے ؎

ہفتاد و دو فریق حسد کے عدو سے ہیں

مولانا نے لکھا ہے کہ:

"۱۸۵۲ء میں مرزا خدا بخش ایک معزز شاہزادے نے قلعہ میں مشاعرہ شروع کیا۔ شاہزادۂ مذکور مومن خاں کے شاگرد تھے مگر استاد کو مانتے تھے۔ غرض کہ مشاعرے میں گئے۔ غالب مرحوم، مولوی امام بخش صاحب صہبائی وغیرہ وغیرہ اچھے اچھے اشخاص آئے۔ حضور بالا بالا تشریف لائے اور پس پردہ بیٹھے۔" (دیوانِ ذوق ص ۱۲۳)

اسی طرح جلوۂ داغ میں بھی مذکور ہے کہ:

"(داغ) فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ زینت باڑی میں مشاعرہ ہوا۔ گیسو اپنا، جادو اپنا۔ اس ردیف و قافیہ میں مصرع دیا گیا تھا۔ مولوی امام بخش صہبائی کا زمانہ تھا میں بھی غزل لکھ کر لے گیا تھا۔ جب میں نے یہ مقطع پڑھا لگ گئی چپ تجھے اے داغ حزیں کیوں لیسی

مجھ کو کچھ حال تو کمبخت بتا تو اپنا

اس کو سنتے ہی آفریں صد آفریں کہتے ہوئے صہبائی اٹھے اور مجھے گلے لگا لیا۔" (بجوار [illegible])

Marfat.com

۱۲۷۲ھ/۵۶-۱۸۵۵ء کی تحریریں

مثنوی دمغ الباطل کے بعد ۱۲۷۲ھ مطابق ۵۶-۱۸۵۵ء کی لکھی ہوئی صہبائی کی صرف دو تحریروں کا پتا چلتا ہے اور وہ دونوں مختصر ہیں یعنی:

دیباچۂ بیاضِ شوق پیام ، اور تقریظ آئینِ اکبری

اول الذکر ایک بیاض کا دیباچہ ہے جس میں صہبائی نے اپنی متفرق تحریریں جمع کی تھیں "بیاضِ شوق پیام" اس کا تاریخی نام ہے۔

۱۲۷۲

جس سے سالِ ترتیب کا پتا چلتا ہے۔ اب اس بیاض کا صرف دیباچہ باقی رہ گیا ہے۔ اس دیباچہ میں بقول ڈاکٹر خواجہ محمد حامد مرتب یعنی صہبائی نے یہ ارادہ ظاہر کیا ہے کہ:

"وہ اس بیاض کے مشتملات میں سے بعض کی عبارت آرای اپنی طرزِ خاص میں کرنا چاہتے ہیں۔ بعض کی عبارت آرای دیگر حضرات کی وضع پر یعنی ظہوری یا بیدل کے انداز پر" (امام بخش صہبائی ص ۱۲۱)

Marfat.com

اِس بیاض میں دیباچۂ بیاضِ اشواق کی شمولیت غالباً اِس حقیقت
۱۲۴۶
کی غماز ہے کہ اُس قدیم بیاض کے اوراق ضایع ہونے لگے تھے اور اب
پچیس چھبیس برس کے بعد صہبائی نے ابتدائی عمر کی اپنی تحریروں کے
بجائے نئی عبارتوں سے ایک نئی بیاض ترتیب دے ڈالی۔ اِس نئی بیاض
میں اُنھوں نے بعض قدیمی تحریروں کو بجنسہٖ یا شاید نظرِ ثانی کرکے یادگار
کے طور پر شامل کر لیا تھا۔

شیخ امام بخش صہبائی کی شہادت کے بعد اُن کے عزیز شاگرد منشی
دین دیال نے جب اُن کی تحریروں کو جمع کرکے بیاضِ اشواق کو بھی
اپنے طور پر مرتب کیا۔ منشی صاحب نے صہبائی کی متفرق تحریروں کو
فراہم کرکے اُنھیں بھی اِس بیاض میں شامل کر دیا۔ بمبئی موجودہ اِس
کی کیفیت فہرست میں اِس طرح درج ہے:

"بیاضِ شوق پیام۔ نثرہائے متفرق و دیباچہ ہا و خواتیم
شروح و رسایل و تقاریظِ نظم و نثر و مکاتیب نثر
رقعات کہ ہر یک در حسن و خوبی عبارت نظیر خود ندارد"

صہبائی کی ایک کتاب "انشائے مکاتیب" بھی جس کا ذکر سرسید
احمد خاں نے کیا ہے، بعض جدید مکتوبات کے اضافے کے ساتھ اِس
بیاض کا جزو بنا دی گئی ہے۔ اب اِس بیاض کی جو مطبوعہ صورت ۱۶۷
صفحات کی ہے اور یہ کلیاتِ صہبائی کی پہلی جلد میں شامل ہے۔

صہبائی کی لکھی ہوئی نفرتیلا آئینِ اکبری کا دیباچہ اِس طرح ہے کہ
۱۲۷۲ھ مطابق ۱۸۵۶ء میں اُن کے عزیز اور مخلص دوست سید
احمد خاں بہادر نے آئینِ اکبری کو مرتب کرکے شایع کرنا چاہا۔ اِس کتاب
کے لیے صہبائی کے علاوہ مرزا اسد اللہ خاں غالب نے بھی بہت محنت سے

Marfat.com

فارسی میں ایک منظوم تقریظ لکھنے کی تھی اور اس میں بہت سے خیال پیش کیے تھے لیکن سرسید اُن کے خیالوں سے اتفاق نہ کرتے تھے اس لیے اُنھوں نے اس تقریظ کو اپنی کتاب میں شامل کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ اس واقعے کا ذکر کرتے ہوئے مولانا الطاف حسین حالی نے لکھا ہے:

"دہلی کے جن نامور لوگوں کی تقریظیں آثار الصنادید کے آخر میں درج ہیں، اُنھوں نے آئینِ اکبری پر بھی نظم یا نثر میں تقریظیں لکھی تھیں مگر مولانا صہبائی کی تقریظ چھپی ہے۔ مرزا غالب کی تقریظ جو ایک چھوٹی سی فارسی مثنوی ہے وہ کلیاتِ غالب میں موجود ہے مگر آئینِ اکبری میں سرسید نے اُس کو قصداً نہیں چھپوایا۔"

(حیاتِ جاوید ص۲۰۲)

شیخ امام بخش صہبائی کے لیے آئینِ اکبری سے دلچسپی کی کئی وجہیں تھیں۔ سب سے پہلی یہ کہ سرسید کو وہ "کشورِ جان دول کے کارفرما" کہتے تھے اور ان کی ہر خواہش کا نہایت احترام کرتے تھے اور آئینِ اکبری کی تصحیح کا کام سرسید نے نہایت محنت اور دیدہ ریزی سے کیا تھا۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ اس کتاب میں ماضی کے شاندار واقعات کا بیان اس ملک کے ایک باکمال عالم نے کیا تھا اور صہبائی کو اپنے ملک اور اس کے بیش بہا علمی سرمائے سے نہایت محبت تھی۔ تیسرے قدیم متن کی تصحیح کا کام جسے خود صہبائی کی دلچسپی کا تھا اور انھیں اس کام کا سلیقہ بھی تھا سرسید کی کاوش اور محنت کی داد دے بھی سکتے تھے۔ صہبائی اس نکتہ کو سمجھتے تھے کہ جڑ سے اکھڑ کر کوئی درخت شاداب رہ ہی نہیں سکتا۔ ماضی کی روایات کو فراموش کر کے کوئی قوم اپنے تشخص کو برقرار نہیں رکھ سکتی۔ کوئی زبان یا ادب اپنے قدیمی سرمائے کو نظرانداز کر کے وقیع

Marfat.com

نہیں ہو سکتا چنانچہ اُنھوں نے سرسید کی کتاب آئینِ اکبری پر تقریظ لکھتے ہوئے جی کھول کر اُن کے کام کی داد دی۔ کسی بھی صاحبِ ہنر کے لیے سخن شناس کی تحسین سے بڑھ کر کوئی انعام نہیں ہو سکتا۔ صہبائی کی تقریظ نے سرسید کو دوسرے شخص کی خامہ فرسائی سے بے نیاز کر دیا تھا۔

مثنوی دمغ الباطل کے معرکے کے بعد ایک ڈیڑھ برس کے اندر ہی یہ دوسرا واقعہ ہو گیا جس سے غالب کو ملال ہوا۔ شیخ امام بخش صہبائی کی طرف سے اُن کے دل میں کدورت بیٹھ گئی۔ مرزا غالب اپنی تقریظ کو بہت اہمیت دیتے تھے۔ اِس میں شبہ نہیں کہ اُس میں جس طرح انگریز نوازی کی گئی ہے۔ اُس دور کا سب سے بڑا انگریز پرست بھی اُسے انگیز نہ کر سکا۔ سرسید نے اُسے اپنی کتاب میں شامل نہ کیا تو وہ کلیاتِ غالب میں شریک ہو کر محفوظ ہو گئی۔

Marfat.com

چند اور رسالے

شیخ امام بخش صہبائی کی بعض تصانیف ایسی بھی ہیں جن کے زمانۂ تصنیف کا پتا نہیں چلتا۔ ناچار اُن کا ذکر آخر میں کیا جا رہا ہے۔

رسالہ نتایج الافکار:

یہ مختصر رسالہ بیاض کے طور پر مرتب کیا گیا ہے۔ اِس کے دیباچے میں صہبائی نے بیان کیا ہے:

"میری طبیعت پہلے اِس پر مائل ہوئی تھی کہ فنِ عروض و قافیہ اور صنّاعتِ معمّا پر رسالے، نیز فارسی کی کتبِ متداولہ پر شرحیں اور حاشیہ، نیز صاحب زبانِ عجم کے رسالوں پر تعلیقے لکھوں اور اب چاہتی ہے کہ جو کچھ مرورِ زمانہ سے دل میں آئے اِن اوراق میں درج کر دوں"۔

(امام بخش صہبائی ص ۱۳۶)

بظاہر یہ بات آخرِ عمر کی ہے جب صہبائی کے علم، تجربے اور مشاہدے میں اتنی پختگی آ گئی تھی کہ وہ اپنے تاثرات اور واقعات کو اِس قدر مفید خیال کرنے لگے تھے کہ اُن کو قلمبند کر کے یادگار کے طور پر چھوڑ دینا چاہتے تھے۔

Marfat.com

صہبائی نے رسالہ نتایج الافکار کو دو فصلوں پر تقسیم کیا ہے۔ پہلی فصل مختصر ہے اور وہ صنعتِ مجمل سے متعلق ہے اِس میں اُنھوں نے اپنے اور بعض دوسرے استادوں کے مجملوں کا حل پیش کیا ہے۔ دوسری فصل میں انھوں نے ہندوستان کے فارسی دانوں کی بے راہروی کی مذمت کی ہے کہ اتنی بے مائگی کے باوجود وہ اُساتذۂ زبان کو خاطر میں نہیں لاتے ہیں۔ صہبائی کی یہ بحثیں بہت دلچسپ اور توجہ طلب ہیں۔

حلِّ مقاماتِ عبدالواسع ہانسوی:

یہ صہبائی کی کوئی باضابطہ تصنیف نہیں ہے بلکہ شاگردوں نے درس کے دوران جو فوائد و اشارات اُن سے معلوم کر کے قلمبند کر لیے تھے مفتی دین دیال نے اُن کو ایک رسالے کی صورت میں ترتیب دے کر کلیاتِ صہبائی میں شامل کر دیا ہے۔ یہ رسالہ صرف گیارہ صفحوں پر مشتمل ہے۔ شروع رسالہ میں منشی صاحب نے یہ عبارت لکھکر رسالے کی صحیح کیفیت کی نشاندہی کر دی ہے:

"حلِّ بعضی از مقاماتِ رسالہ عبدالواسع ہانسوی کہ از استادی مولانا صہبائی مدظلہٗ وقتِ سبق گرفتن املا دہ شدہ"

اِس عبارت میں صہبائی کے نام کے ساتھ "مدظلہٗ" کا لکھا جانا اس حقیقت پر دلالت کرتا ہے کہ یہ رسالہ منشی دین دیال اپنے استاد کی زندگی میں مرتب کر چکے تھے۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ رسالہ صہبائی کی نظر سے گذر سکا تھا یا نہیں۔

شیخ امام بخش صہبائی کی مختلف تحریروں سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ملا عبدالواسع کی علمی حیثیت کا اعتراف کرتے تھے اور اُن کی تصانیف کو لائقِ توجہ اور قابلِ مطالعہ سمجھتے۔ اس کے برخلاف صہبائی

Marfat.com

کے معاصر مرزا اسد اللہ خاں غالب اِس شخص کے بارے میں ایک خط میں فرماتے ہیں:

"وہ گھاگھس اُلّو عبدالواسع ہانسوی لفظ نامراد کو غلط کہتا ہے"۔ (خطوطِ غالب ص۸۴)

اِس سے دونوں کے مزاجوں کے تفاوت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

رسالہ مناقشاتِ سخن۔

شیخ امام بخش صہبائی کی دستیاب تحریروں میں یہ واحد رسالہ ہے جس میں اُنھوں نے اپنے کسی معاصر کے علمی کارنامے کے خلاف قلم اٹھایا ہے۔ مولوی محمد حسین شوکت نے اپنی تقریظ میں اس رسالے کا تعارف کراتے ہوئے لکھا ہے:

"مولوی امام علی مقتول سطرے چند نگاشتہ و دعواے ہمہ دانی خود را بہ آسمان رسانیدہ بود، با خود میگفت کہ کمندِ اندیشۂ معانی بر بامِ معلقاتش نتواند رسید لیکن صہبائی کلامِ مولوی مقتول را از تراکیبِ نحویۂ آں چناں ساقط الاعتبار ثابت کردہ کہ دعواے او باطل گردیدہ۔ ایں مناظرہ ہم دیدنی است"

افسوس ہے کہ متداول تذکروں میں مولوی امام علی مقتول کا ذکر نہیں ملا۔ اُن کی وہ تحریر بھی جس کا شیخ امام بخش صہبائی نے جواب لکھا ہے دستیاب نہیں ہو سکی۔ یہ بھی نہیں معلوم کہ وہ کون سے اسباب اور محرکات تھے جنھوں نے صہبائی جیسے خاموش، منکسر اور متحمّل مزاج شخص کو ردّ لکھنے کے لیے قلم اُٹھانے پر مجبور کر دیا۔ ڈاکٹر خواجہ محمد حامد نے بھی اِس بارے میں صرف اتنا لکھا ہے:

"صہبائی کے [illegible] امام علی مقتول تھے جو بر خود غلط انسان تھے۔ اُنھوں نے اپنی انشا کا نمونہ ایک مکتوب کی

Marfat.com

شکل میں پیش کیا جس میں اُنھوں نے مکتوب الیہ سے اپنا جواب اور اُس کی تعبیر بیان کی تھی۔ وہ اپنی اِس انشا پر نازاں تھے۔ صہبائی نے اِس رسالے میں اُن کی انشا کا تجزیہ کیا اور اُس کی لفظی و معنوی غلطیاں دکھائی ہیں۔ یہ رسالہ کلیاتِ صہبائی حصہ دوم، جلد ثانی میں شامل ہے اور بائیس صفحوں پر مشتمل ہے"۔ (امام بخش صہبائی ص۱۴۰)

انیسویں صدی عیسوی کے وسط میں فارسی انشا کے تجزیے اور انشا پردازی کے ضابطوں اور معیاروں کی تفہیم کے لیے شیخ امام بخش صہبائی کا یہ رسالہ مفید ہے۔

رسالہ غوامضِ سخن۔

زبان جامد نہیں ہوتی۔ وقت اور حالات کے ساتھ ساتھ اُس میں تبدیلیاں رونما ہوتی رہتی ہیں۔ شیخ امام بخش صہبائی نے فارسی کی قدیم تصانیف کا بخوبی مطالعہ کیا تھا۔ فرہنگوں اور کتبِ لغات پر اُن کی بہت گہری نظر تھی۔ اُنھوں نے بدلتے ہوئے حالات اور وقت کے تقاضوں کے مطابق لفظوں، محاوروں اور ترکیبوں میں پیدا ہونے والی تبدیلیوں کو محسوس کیا تھا، سمجھا اور جانا تھا۔ [illegible] نے اپنے طور پر قلمبند کر لیا تھا چنانچہ منشی دین دیال [illegible] ہے:

"میں جس زمانے میں حضرت صہبائی سے دواوین و منشیات کا درس لیتا تھا تو دیکھتا تھا کہ اُن کا قلمِ بلاغت رقم نکاتِ فارسی فراہم کرنے میں مصروف ہے۔ ایک روز میرے دریافت کرنے پر فرمایا کہ اساتذہ کے نتایجِ طبع سے نکاتِ سخن جمع کرتا ہوں تاکہ کلامِ متقدمین کی وسعت معلوم ہو اور استعدادِ متاخرین

Marfat.com

کی شان بڑھے۔ اُس کے بعد فکرِ معاش نے مجھے (دین دیال کو) اُن (صہبائیؒ) کی خدمت سے محروم کر دیا اور وہ جنت کو سدھارے۔ تلاش پر اُس نسخے کا سراغ نہیں ملا لیکن جب اتفاق سے میں اندور گیا تو وہاں مولوی محمد حسین بحرؔ تلمیذ حضرت مغفور کے پاس وہ مل گیا اور کلیات میں شامل کر دیا گیا۔"

(امام بخش صہبائیؒ ص۱۴۰)

منشی دین دیال کے اِس بیان سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ رسالہ صہبائیؒ نے آخر زمانے میں مرتب کرنا چاہا تھا۔ معلوم نہیں وہ اِس کام کو حسب دلخواہ مکمل کر کے اِس پر نظرِ ثانی بھی کر سکے یا نہیں بظاہر وہ صرف یادداشتیں جمع کر سکے تھے جن کو مرتب کرنے کا کام منشی دین دیال نے انجام دیا ہوگا۔

ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا نے بھی لکھا ہے:

"منشی دین دیال نے اِس مجموعے کو حروفِ تہجی کی ترتیب سے سجا کر اِس کا نام رسالہ غوامضِ سخن رکھ دیا۔ اِس کی ضخامت بیاسی ۸۲ صفحات ہے، جو موضوع کے اعتبار سے بہت کم ہے غالباً تصنیف نامکمل ہے۔"

(امام بخش صہبائیؒ ص۱۴۰)

جو بھی ہو، اِس رسالے کو شایع کر کے منشی صاحب نے ایک قابلِ قدر کام کیا۔ اِس رسالے سے صہبائیؒ کے مثبت اندازِ فکر کی عکاسی ہوتی ہے۔

دیوانِ صہبائیؒ (فارسی)

یہ شیخ امام بخش صہبائیؒ کے فارسی کلام کا مختصر سا مجموعہ ہے اور مختلف اصناف میں صہبائیؒ کے کہے ہوئے کم و بیش ایک ہزار شعروں پر

Marfat.com

مشتمل ہے۔ دیوان کی ضخامت چونسٹھ صفحوں کی ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ صہبائی کو شعر گوئی سے کچھ زیادہ دلچسپی نہیں تھی۔ وہ عموماً بہ ضرورت شعر کہتے تھے مثلاً کسی طرحی مشاعرے میں پڑھنے کے لیے غزل کہہ لیتے تھے یا کسی عالم شخص کی خدمت میں عقیدت کے ساتھ اور کسی امیر کے سامنے اظہارِ تشکر کے لیے رباعی یا قصیدہ کہہ لیتے تھے۔ اپنی مختلف اور متعدد تصانیفِ نثر میں توضیحِ مطالب کے مقصد سے یا اپنی بات کو زیادہ بہتر طور پر پیش کرنے کے لیے بھی انھوں نے شعر کہے ہیں۔

شیخ امام بخش صہبائی کا کچھ متفرق کلام اُن کے معاصروں اور شاگردوں کی کتابوں میں بھی مل سکتا ہے۔ مثال کے طور پر محمد حسین خاں تحسین کے مرتب کردہ خمسہ ہائے غزل قدسی میں بھی جس کی طباعت ۱۲۷۱ھ مطابق ۱۸۵۴ء میں مکمل ہوئی تھی۔ صہبائی کا کہا ہوا خمسہ بھی شامل ہے جو بہ زبانِ فارسی ہے۔ صہبائی کی شاعری کا جائزہ لیتے ہوئے اُن کے ایسے تمام منتشر کلام کو بھی سامنے رکھنا مناسب ہے۔

Marfat.com

خاتمہ

شیخ امام بخش صہبائیؔ مذہب پسند آدمی تھے۔ زندگی کا بڑا حصہ عسرت اور مفلسی میں بسر کیا تھا اور اپنی تنگدستی اور پریشان حالی کو جبہ و دستار میں چھپائے رہتے تھے۔ گارساں دتاسی کا بیان ہے کہ:

"وہ ہمیشہ پرانی وضع کا لباس پہنتے تھے"۔ (خطبات ۱۸۹)

مرزا فرحت اللہ بیگ نے صہبائیؔ کے لباس کی کیفیت اس طرح بیان کی ہے:

"سر پر پٹے ہیں۔ بڑے دبلے پتلے آدمی ہیں ..... ایک پرکا سفید پاجامہ، سفید انگرکھا، کشمیری کام کا جبہ پہنتے ہیں اور سر پر چھوٹا سا سفید صافہ باندھتے ہیں"۔

(دلی کی آخری شمع ص ۲۸)

اس صوفیانہ وضع سے صہبائیؔ ساری زندگی کاٹ گئے۔ لہو و لعب کھیل تماشوں کی سیر کے لیے اُن کے پاس وقت نہیں تھا۔ تیز نا بھی نہیں جانتے تھے۔ نماز جماعت سے ادا کرتے تھے۔ ۱۸۵۷ء میں گرفتار ہو کر شہید ہوئے۔ مولوی محمد ذکاء اللہ کا کہنا ہے:۔

Marfat.com

"نواب شیر جنگ کے بیٹے محمد علی خاں نے ایک (انگریز) سپاہی کو اِس لیے زخمی کیا تھا کہ وہ اُن کے زنانے میں بدنیتی سے جانا چاہتا تھا۔ اِس قصور میں (انگریز) حاکموں نے حکم دیا کہ اِس کوچے کے سارے مردوں کو مار ڈالو۔ اُن بیگناہ مقتولوں میں ایک صاحب کمال (امام بخش صہبائی) اور اُن کے کنبہ کے ۲۱ افراد بھی تھے۔"

(بحوالہ بہادر شاہ ظفر ص۵)

یہ بات غور طلب ہے کہ صہبائی دلی کالج کے ہر دلعزیز استادوں میں تھے جو انگریزوں کی نگرانی میں تھا۔ اِس تعلق کے باوجود صہبائی کے خاندان کے ۲۱ افراد شہید کر دیے گئے۔ اِس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انگریزوں کی ملازمت کے باوصف ذہنی طور سے صہبائی اُن کے "ملازم" نہیں ہو سکے تھے۔ وہ المامور معذور کے بمصداق انگریز پرنسپل کے احکام کی دیانتداری سے تعمیل کرتے لیکن دل سے اپنے مذہب اور اپنے بادشاہ کے معتقد اور حامی تھے اور اپنے اہل خاندان کو بھی اُنھوں نے اسی انداز پہ ڈھالا تھا۔ اس اعتبار سے صہبائی اپنے اُس معاصر سے بالکل مختلف تھے جس نے غدر کے وقت بلکہ بہادر شاہ کے زمانے میں ہی انگریزوں کی ہر طرح مدّاحی کو وتیرہ بنا لیا تھا۔

شیخ امام بخش صہبائی کی شہادت کے واقعہ کو علامہ راشد نے اِس طرح قلمبند کیا ہے۔

"مولانا قادر علی صاحب مولانا صہبائی کے حقیقی بھانجے تھے اور اُن ہی کے ساتھ اُن کے گھر میں رہتے تھے۔ ایک موقع پر بیان کرتے تھے کہ میں صبح کی نماز اپنے ماموں

Marfat.com

مولانا صہبائیؒ کے ساتھ کٹڑہ پیر پرور[1] کی مسجد میں پڑھ رہا تھا کہ گورے دن دن کرتے آ پہنچے۔ پہلی رکعت تھی کہ امام کے صافے سے ہماری مشکیں کس لی گئیں۔۔۔۔ ہم گرفتار ہو کر دریا کے کنارے لائے گئے ابھی غدر کو ایک ہفتہ بھی نہیں ہوا تھا اور پھانسیوں کے بجائے باغی گولیوں کا نشانہ بنتے تھے۔ مسلح سپاہیوں نے اپنی بندوقیں تیار کیں۔ ہم تیس چالیس آدمی اُن کے سامنے کھڑے تھے ایک مسلمان افسر نے ہم سے آ کر کہا کہ موت تمہارے سر پر ہے۔ گولیاں تمہارے سامنے ہیں اور دریا تمہاری پشت پر ہے۔ تم میں جو لوگ تیرنا جانتے ہیں، وہ دریا میں کود پڑیں۔ میں بہت اچھا تیراک تھا مگر ماموں صاحب یعنی مولانا صہبائیؒ اور اُن کے صاحبزادے مولانا سوز تیرنا نہ جانتے تھے اِس لیے دل نے گوارا نہ کیا کہ اُن کو چھوڑ کر اپنی جان بچاؤں۔ لیکن ماموں صاحب نے مجھے اشارہ کیا اِس لیے میں دریا میں کود پڑا۔ میں تیرتا ہوا آگے بڑھتا اور پیچھے مڑ مڑ کر دیکھتا جا رہا تھا۔ پچاس ساٹھ گز گیا ہوں گا کہ گولیوں کی آوازیں میرے کان میں آئیں اور صف بستہ گر گر مر گئے۔" (دلّی کی آخری بہار ص۷۸ تا ص۷۹)

یہ واقعہ غالباً ستمبر ۱۸۵۷ء (مطابق صفر ۱۲۷۴ھ) کی آخری تاریخوں میں پیش آیا ہوگا۔ صہبائیؒ کے ساتھ جو لوگ شہید ہوئے اُن میں عزیز، سوز

---

[1] ممکن ہے کہ اُس زمانے میں صہبائیؒ کے مکان سے قریب ترین مسجد یہی رہی ہو۔ [2] بعض لوگوں کا یہ خیال کہ صہبائیؒ کو پھانسی دی گئی تھی صحیح نہیں ہے۔

Marfat.com

بسمل، رند وغیرہ سب شامل تھے۔ مولوی محمد ذکاء اللہ نے اِس واقعہ سے متعلق لکھا ہے۔

"اُن میں دو آدمی مرزا مصطفیٰ بیگ اور وزیر الدین زندہ بچے جو اِس قتل کا حال بیان کرتے تھے کہ ہم سب دست بستہ جمنا کی ریتی میں گیے۔ گولیوں کی باڑھ ہم پر سپاہیوں نے صرف ایک دفعہ ماری پھر وہ چلے گیے۔ بہت سے تو گولیوں کے لگتے ہی سرد ہو گیے۔ بعض اُن میں دریا کی طرف بھاگے۔ آگ سے بچے مگر پانی میں ڈوب کر مر گیے اُن دو آدمیوں میں سے مصطفا بیگ قلعے کی طرف بھاگے اُن کے گولی نہیں لگی تھی اور وزیر الدین مہابت خاں کی ریتی کی طرف دوڑے۔ اُن کی ساق میں ضعیف سا گولی کا زخم لگا تھا یہ دونوں بچکر زندہ سلامت رہے۔ اُن مقتولوں میں بیگناہ ایک صاحب کمال مولوی امام بخش صہبائی اور اُن کے کنبے کے اکیس مرد تھے جن میں سے مولوی صاحب کا بھانجہ جو داماد بھی تھا وزیر الدین بچا باقی سب فنا ہوے۔"

مذکورہ دونوں بیانوں کو مطابق کریں تو معلوم ہوگا کہ اُس گولیوں کی باڑھ سے بچنے والے کم سے کم تین شخص ضرور تھے۔ ممکن ہے ایک آدمی اور بھی کوی بچا ہو لیکن اُس کا حال فی الوقت معلوم نہیں۔

صہبائی کے دونوں بھانجے یعنی قادر علی اور وزیر الدین اِس قیامتِ صغریٰ کی خبر لے کر گھر پہنچے۔ وہاں محلّے میں ایک آفت برپا تھی ظہیر دہلوی کا کہنا ہے کہ:

"عورات کا یہ حال ہوا کہ گھر [illegible] میں سے نکل نکل بچوں [illegible]

Marfat.com

کنوؤں میں جا گریں۔ چیلوں کے کوچے کے تمام کنوئیں لاشوں سے پٹ گئے تھے۔"

وزیرالدین اپنی بیوی اور ساس وغیرہ کو لے کر دہلی سے نکلا اور اپنے قدیمی وطن تھانیسر جا پہنچا۔ رام بابو سکسینہ نے صہبائی کے ذکر میں لکھا ہے:

"صہبائی قدیم دلی کالج میں فارسی اور عربی کے پروفیسر بہت روشن خیال اور اخلاقی جرأت کے آدمی تھے۔ زبانِ فارسی میں آن کو کمال حاصل تھا اور اُس زمانے میں جب کہ فارسی کا دور دورہ تھا ایک خاص عزت اور قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے اور اُن کی قابلیت اور شہرت کا طلبا کے دل پر بڑا اثر تھا۔ فنِ شعر میں استاد مشہور تھے اور قلعہ کے اکثر شاہزادے اور متوسلین اُن سے اصلاح لیا کرتے تھے۔ متعدد کتابیں اُن سے یادگار ہیں۔ زمانہ غدر میں مارے گئے اور اُن کا مکان کھود کر زمین کے برابر کر دیا گیا۔" (تاریخ ادب اردو، نثر ص۸)

مکان کے کھود دے جانے کا واقعہ یقینی طور سے بعد کا ہوگا۔ صہبائی کے ساتھ انگریز سپاہیوں نے یہ سلوک کیوں کیا، اس کا جواب دینا فی الوقت ممکن نہیں، ظاہرا ایک وجہ یہ ہو سکتی ہو کہ کسی بد باطن نے صہبائی کے خلاف کوئی ایسی بات پہنچائی ہوگی جس نے اُن کے خلاف انگریزوں کو نہایت مشتعل کر دیا ہوگا، حالانکہ مولوی ذکاء اللہ جیسے انگریز پرست بھی صہبائی کی بیگناہی کے شاہد ہیں۔ مفتی صدر الدین خاں آزردہ نے جب صہبائی کا انجام سنا تو بڑے درد سے کہا

کیونکہ آزردہ نکل جائے نہ سچ ای ہو قتل اِس طرح سے بیجرم جو صہبائی ہو

Marfat.com

یہ نہ معلوم ہو سکا کہ صہبائی اور اُن کے ساتھ شہید ہونے والوں کو کس نے، کب، اور کہاں دفن کیا۔

سلطنتِ انگریزی کے استحکام کے بعد سرسید احمد خاں نے بڑی کوشش سے اپنے مرحوم دوست شیخ امام بخش صہبائی شہید کے پسماندگان کے لیے کچھ وظیفہ جاری کرا دیا تھا۔ صہبائی کی بیوہ زندگی کے دن پورے کرنے کے بعد تھانیسر میں اللہ کو پیاری ہو گئیں۔ وہیں سے صہبائی کے نواسے محمد حمید الدین کا ایک خط سرسید کے پاس آیا تھا جس میں اُنھوں نے لکھا تھا:

"مولانا امام بخش صہبائی جو اِس عاجز کے نانا تھے، ایامِ غدر میں اُن کے بیگناہ قتل ہونے پر عالی حضرت (سرسید) نے جناب نانی صاحبہ و دیگر درماندگان کا وظیفہ سرکارِ انگریزی سے مقرر کرا دیا تھا جب تک نانی صاحبہ زندہ رہیں بدستور وظیفہ ملتا رہا۔ بندے نے والدین سے سُنا تھا کہ جو احسانات آنجناب کے اِس خاندان کے ساتھ ہوئے ہیں وہ بیان سے باہر ہیں۔" (حیات جاوید، حاشیہ ص۳۶)

اِس خط کے الفاظ بتا رہے ہیں کہ حمید الدین نے سرسید سے کسی قسم کی مدد چاہی تھی۔ معلوم ہوتا ہے کہ تھانیسر میں وزیر الدین اور اُس کے اخلاف بے روزگاری کے سبب مفلسی اور تنگدستی میں بسر کر رہے تھے اور کم و بیش وہی حال حمید الدین کا بھی تھا۔ معلوم نہیں کہ اب حمید الدین کے اخلاف میں کوئی موجود ہے یا نہیں۔ اپنے بے مثال کارناموں کے سبب صہبائی کا نام البتہ باقی ہے۔ کرپا رام مہجور نے ۱۳۲۳ھ مطابق ۱۹۰۵ء میں اپنے تذکرہ "غمنامۂ جانسوز" میں لکھا ہے

"صہبائی تخلص مولوی امام بخش در تحقیقِ الفاظ گوئے سبقت

Marfat.com

از پیشینیان ربودہ۔ شروحِ کتبِ مشکلۂ فارسی
بشرح و بسط بیان چناں تقیدِ تحریر آوردہ کہ کم استعدادان
سوادِ علم ہم کما حقہٗ بمضامینش پے بُرد۔۔۔ زہے
مکتہ سنج یکتا کہ بہ عوامی فکرِ رسا از بحرِ معمّہ چناں دُرِّ شاہوار
بدست آورد کہ وصفش نمی تواں نمود۔ اگر ترکِ ادب
نبودے گفتمے کہ مولانا جامی را ہم دریں فن ایں مایہ دستگاہے
نبود۔"

Marfat.com

ماخذ

اردوے معلّا (حصہ دوم) از غالب مطبع مجتبائی دہلی

امام بخش صہبائی از ڈاکٹر خواجہ محمد حامد ناگپور ۱۹۸۲ء

انتخابِ رعنی از محمد انصار اللہ علی گڑھ

بحر الفصاحت از حکیم نجم الغنی خاں مطبع نولکشور لکھنؤ ۱۹۶۹ء

پنج آہنگ (آہنگ پنجم) از غالب مترجمہ محمد عمر مہاجر۔ کراچی ۱۹۶۹ء

تاریخِ ادب اردو از رام بابو سکسینہ (اردو ترجمہ) مطبع نیچکمار لکھنؤ، ۱۹۶۹ء

تذکرہ اہل دہلی از سر سید احمد خاں (مرتب) قاضی احمد میاں اختر جوناگڑھی، کراچی ۱۹۵۵ء

تذکرۂ نادر از کلب حسین خاں نادر مرتب سید مسعود حسن رضوی ادیب

ترجمہ حدائق البلاغت از امام بخش صہبائی مطبع نولکشور لکھنؤ

جامع القواعد (حصہ صرف) از ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی مرکزی اردو بورڈ، لاہور ۱۹۷۱ء

جائزۂ مخطوطاتِ اردو (جلد اول) (مرتب) مشفق خواجہ، مرکزی اردو بورڈ، لاہور ۱۹۷۹ء

حلِ کلیاتِ اردوے مرزا غالب از حافظ احمد حسن شوکت میرٹھی

Marfat.com

بیاضِ جاوید — از الطاف حسین حالی، ترقی اُردو بورڈ نئی دہلی ۱۹۷۹ء

خزینۃ الاصفیا — از غلام سرور لاہوری — مطبع ثمر ہند لکھنؤ۔

خطباتِ گارساں (ترجمہ اردو) انجمن ترقی اردو، اورنگ آباد، ۱۹۳۵ء

خطوطِ غالب (مرتب) مالک رام - انجمن ترقی اردو، علی گڑھ ۱۹۶۲ء

خمخانۂ جاوید — از لالہ سری رام جلد سوم تا پنجم

دہلی کی آخری شمع — از مرزا فرحت اللہ بیگ ۱۹۳۳ء

دیوانِ ذوق (مرتب) مولانا محمد حسین آزاد مطبوعہ علیمی پرنٹنگ ورکس دہلی

رسالۂ تذکرات — از مولوی محمد ذکاء اللہ (مرتب) ڈاکٹر تنویر احمد علوی

مشمولۂ سرمایہ تحریر دہلی

رسالہ قواعد صرف و نحو اردو - از امام بخش صہبائی

سرضابطۂ ہندی — از مرزا رفیع سودا مشمولۂ اردو کے حروف تہجی

مولفہ محمد انصار اللہ ۱۹۷۱ء

سخن شعراء — از عبدالغفور خاں نساخ یوپی اردو اکیڈیمی لکھنؤ

سراپا سخن — از محسن لکھنوی — مطبع نولکشور

سفینۂ خوشگو — از بندرابن داس خوشگو (مرتب) عطا کاکوی

طبقات شعرائے اردو — از مولوی کریم الدین

عجالۃ العلالہ — از مولوی کریم الدین ۱۸۴۵ء

غالب — از غلام رسول مہر — آزاد بکڈپو، امرتسر

غالب اور صفیر — از مشفق خواجہ - عصری مطبوعات، کراچی ۱۹۸۱ء

فہرست نسخہائے خطی فارسی مؤرخہ ملی پاکستان کراچی، نگاشتۂ سید طارق نوشاہی ۱۹۸۳ء

فہرست نمائش ادارۂ تحقیقات اردو پٹنہ مرتبہ قاضی محمد سعید مطبوعہ ۱۹۵۹ء

قاطع برہان — از مرزا غالب (مرتب) قاضی عبدالودود ۱۹۶۷ء

قولِ فیصل — از امام بخش صہبائی — مطبع نظامی کانپور ۱۲۷۸ھ

Marfat.com

گلدستۂ نازنینان — از مولوی کریم الدین — ۱۸۴۵ء

گلستان سخن — از مرزا اقادز بخش صابر
مقدمہ از ڈاکٹر وحید قریشی

گلستانِ بیخزاں — از قطب الدین باطن یوپی اردو اکیڈمی لکھنو

گلشنِ بیخار — از نواب مصطفاخاں شیفتہ یوپی اردو اکیڈمی

مجموعۂ نغز — از حکیم قدرت اللہ قاسم
(مرتب) حافظ محمود خاں شیرانی

مرحوم دہلی کالج — از مولوی عبدالحق

مقالاتِ شیرانی (جلد اول تا سوم) (مرتب) مظہر محمود شیرانی
مجلس ترقی ادب لاہور

ماہنامہ نگار رام پور — فروری ۱۹۶۳ء

ماہنامہ نگار پاکستان، کراچی — جنوری، فروری ۱۹۸۲ء

Marfat.com

اشاریہ

الف :- اشخاص

آتش - ۳۱۳

آدم ۱۰۷ -

آرزو سراج الدین علی خاں - ۶۱ تا ۱۲۳ -

آزاد محمد حسین، مولوی - ۹۵ - ۱۴۷ - ۱۵۰ -
۱۵۱ - ۱۶۷ - ۱۷۲ - ۱۷۳ - ۱۸۰ -
۱۹۴ - ۱۹۵ -

آرزدہ صدرالدین خاں، مفتی - ۹۱ تا
۹۳ - ۹۵ - ۱۴۹ - ۲۱۰

آل نبی سہارنپوری، مولوی - ۱۷۴
۳۷ -

آہی میر عبدالرحمٰن خاں - ۱۹۳ -

ابراہیم عادلشاہ ثانی - ۱۱۰

ابواللیث صدیقی، پروفیسر ۱۰۳ - ۱۰۴ -

ابوظفر مرزا (رنگ بہادر شاہ) ۹۰

اثر عبدالرزاق - ۱۹۳

اجودھیا پرشاد، پنڈت (رنگ مبتلا) ۲

احسان عبدالرحمٰن خاں - ۱۴۶ -

احسن اللہ خاں حکیم - ۱۵ - ۱۹ -
۲۰ - ۱۳۷ - ۱۶۹ - ۱۷۲ - ۱۸۴ -
۱۶۱ - ۱۶۲

احمد شاہ بہمنی - ۱۰

احمد منزوی - ۱۳۶

اختر قاضی احمد میاں جوناگڑھی ۱۳۱

اسپرنگر ڈاکٹر ۲۲ - ۱۰۴ -

اشرف صاحب مولوی - ۱۰۳

اشرف علی سید - ۱۰۳

اشرف محمد سجید ماژندرانی -
۱۷۹ - ۱۸۰ -

Marfat.com

اکبر شاہ ثانی ۱۴-۲۰-۲۹-۳۰-۳۱
امام بخش تھانیسری، شاہ - ۱۰-۱۱
امیر بیگ مرزا - ۱۸۴
امیر مینائی - ۱۹۴
انشاء - ۹۳
انوری ۱۶۲
اوج لالہ جگل کشور - ۱۹۳
ایجاد مرزا رحیم الدین - ۱۹۳
باطن قطب الدین حکیم - ۸۹-۹۰
برہان محمد حسین تبریزی - ۱۷۸
بزرگ تھانیسری (رک امام بخش تھانیسری) ۱۴
بسمل نواب امیر حسن خاں - ۱۹۳
بسمل محمد عبدالحکیم - ۱۶ تا ۱۹ - ۲۰۹
بشن نراین - ۱۴۴
بشیر الدین احمد، مولوی - ۹۴
بشیر بشیر الدین شاہ ۱۸۶ تا ۱۸۸
بلاقی مرزا شاہزادہ - ۱۵۱
بلبل گوری شنکر، پنڈت - ۱۹۳
بلدیو سنگھ لالہ (رک [illegible]) - ۱۶۳
بوترو (بوترو [illegible]) - ۷۳-۷۸
[illegible] ۸۸-۹۳-۹۶
۹۹ ۱۰۴ تا ۱۰۶
بہادر جنگ نواب - ۱۵
بہادر شاہ سراج الدین (رک ظفر)
۱۴۷-۱۶۹ ۱۷۲-۲۰۷

بیتاب عباس علی خاں - ۴۰
بیدل - ۱۳۱-۱۳۲، ۱۳۴-۱۹۶
پرنسپل (رک بوترو) ۹۷-۱۰۱
پیر بخش حکیم ۱۴-۱۵ ۱۸ تا ۱۹-۲۲
پیمی شاہ برکت اللہ - ۱۰۱
تحسین محمد حسین خاں ۲۰۵
تسکین میر حسین - ۳۹-۴۰
تمنا عبدالرحمن - ۱۹۳
ٹامسن جی (طامسین صاحب) ۱۴۹
حاجی عبدالرحمن ملا - ۱۰۸-۲۱۲
جرأت ۹۶ ۸۹
جلال الدین تھانیسری ۹-۱۰-۳۷
چندر ناتھ متر ہالر - ۱۱۵
حالی الطاف حسین، مولوی - ۱۵
۳۸-۱۲۶-۱۲۹ تا ۱۳۱-۱۶۶
۱۶۹-۱۹۸
حامد علی خاں اعتماد الدولہ
حزیں شیخ محمد علی اصفہانی ۱۰۱، ۱۳۱
حسرتی (رک شیفتہ) - ۹۱
حسن (میر غلام حسن) ۸۶-۸۹
حسن دہلوی (رک [illegible]) - ۲۱
حسین نیشاپوری میرات ۲۸
حقیر نبی بخش - ۱۶۷
حکمت علی اصغر ڈاکٹر - ۱۷۸
حکیم دورل (رک پیر بخش) ۱۴ -

Marfat.com

حیدر حسن خاں بہادر نواب - ۱۳۶
حیدر خاں میر - ۳۹
حیدر شکوہ مرزا شاہزادہ - ۱۶۷ تا
۱۶۹ - ۱۹۶
حیرت حافظ عبدالرحمان - ۱۹۳
خاقانی شروانی - ۱۶۲ - ۱۷۹
خدا بخش شاہزادہ - ۱۹۵
خلش فردوس علی - ۱۶، ۱۷
خلیل ابن احمد - ۱۹۳
خلیل دوست علی میر ۱۷۱
خلیل علی ابراہیم خاں ۸۹
خوشگو بندرابن داس - ۹
خیال ارشد اشرف - ۱۵۵
خیال فیض الحسن مولوی - ۱۹۳
داغ دہلوی - ۱۹۵
درد - ۸۶ - ۸۹
دھرم نارائن پنڈت ۲۷ - ۱۴۵ تا ۱۴۷
۱۶۳ - ۱۹۴
دین دیال منشی ۱۲ - ۹۱ - ۱۱۰
۱۳۶ - ۱۴۴ - ۱۴۷ - ۱۴۸ - ۱۵۹
۱۸۸ - ۱۸۹ - ۱۹۷ - ۲۰۱ - ۲۰۲ - ۲۰۴
ذکاء اللہ شمس العلماء مولوی ۸۶ - ۸۷
۱۷۲ - ۱۸۷ - ۲۰۶ - ۲۰۹ - ۲۱۰
ذوق محمد ابراہیم شیخ ۲۵ - ۲۷ - ۷۹
۸۶ - ۸۷ - ۱۹۰ - ۱۹۱ - ۱۰۱
[illegible] - ۱۹۵

رابرٹس مسٹر - ۱۲۸
راشد الخیری، علامہ - ۲۰۷
رامبابو سکسینہ ۸۳ - ۲۱۰
رامچندر پروفیسر ۸۴
رحمت اللہ مولوی - ۱۴۳
رحمت رحمت علی ۱۶ - ۱۷
رحیم عبدالرحیم بیگ مرزا ۱۷۸ - ۱۷۹
۱۸۳ - ۱۸۴ - ۱۹۳
رضا کالیداس گپتا ۱۷۳ - ۱۷۴
رفعت مرزا پیارے شاہزادہ - ۱۴۶
رند اکرام الدین - ۲۲ تا ۲۴ - ۲۰۹
رنگین - ۹۳
روشن ضمیر مرزا - ۹۸
زار امام بخش تھانیسری - ۱۹۳
ساقی محمد جعفر گوپاموی ۱۶۴
سحر احمد علی خاں - ۱۹۳
سروپ نراین پنڈت - ۱۴۶
سریرام لالہ - ۲۵ - ۲۷ - ۱۴۶ -
۱۵۰ - ۱۸۳ - ۱۸۸ - ۱۸۹
سلیمان شکوہ مرزا شاہزادہ - ۱۶۶ - ۱۶۷
سعدی ۱۷۹
سودا ۸۶
سوز عبدالکریم مولوی - ۱۶ - ۱۹ - ۲۲
۲۳ - ۲۶ - ۲۷ - ۱۵۰ - ۱۸۷ تا
۱۸۹ - ۲۰۸

Marfat.com

سید احمد خاں (سر) - ۱۲-۱۴ تا ۱۶
۲۰-۲۲-۳۷-۳۸-۱۰۶-۱۱۲ تا ۱۲۶
۱۲۹-۱۳۱-۱۳۴-۱۳۸-۱۴۹-۱۵۲
۱۹۷ تا ۱۹۹-۲۱۱
سید محمد خاں مالک مطبع - ۱۰۲
سید محمد، حکیم ۱۹۴
شاکر عبدالرزاق مولوی - ۱۸۳-۱۸۴
شاہرخ مرزا شاہزادہ - ۱۳۷-۱۵۱
شاہ عالم اول - ۹۸
شاہ عالم ثانی - ۱۰-۱۱-۱۳-۲۱-۱۹۷
شبلی نعمانی مولوی - ۱۲۸ تا ۱۳۰
شرر (رک رحیم بیگ) ۱۸۴
شرر منشار ام - ۱۹۳
شرف الدین علی یزدی ۱۰۰
شفق انوار الدولہ - ۱۸۲
شفقت - میر محمد حسین - ۱۹۳
شوق عنایت اللہ حکیم - ۱۹۲
شوکت احمد حسن میرٹھی (مفتی) ۱۸۲
شوکت محمد حسین مولوی - ۲۰۲
شہنشاہ حال (رک بہادر شاہ) ۱۱۹
شیدای ابوالحسن - ۱۹۳
شیدی رمضانی بیگ مرزا ۱۹۳
شیدی جنگ نواب - ۲۰۷
شیفتہ مصطفےٰ خاں نواب ۱۹-۳۰-۳۹
۴۰-۸۹-۹۱ تا ۹۳-۱۰۰
صابر قادر بخش مرزا ۱۲-۱۶ تا
۲۸-۲۶-۲۵ تا ۲۷-۳۶-۳۸
۱۴۸-۱۵۰-۱۵۹-۱۶۴-۱۶۵-۱۷۹
۱۸۴-۱۸۵-۱۸۸ تا ۱۹۷
صابر تنویر الدین خاں مولوی ۱۹۰
صدیق حسن خاں نواب - ۲۶
صفیر بلگرامی - ۸۰
ضیاء الدین احمد خاں نواب (نیر) ۹۲
طربہ رحیم بخش مولوی ۲۳-۲۴
ظفر (رک بہادر شاہ) ۹۳-۱۴۳
۱۵۱-۱۶۳
ظہوری نور الدین ملا ۹۰-۱۳۱
۱۳۳-۱۹۰
ظہیر [illegible] ۱۰۰
عارف [illegible] ۱۰۰
عالمگیر بادشاہ ۱۴۳
عالی امیر علی مولوی ۱۹۳
عبدالحق مولوی - ۸۲-۸۳
عبدالرزاق سورتی ۹۳-۱۱۰-۱۵۵
عبدالعلی خاں نواب [illegible]
عبدالغنی [illegible] ۸۲-۱۰۳
عبدالقادر شیخ - ۱۹۳
عبدالقادر جیلانی - ۱۰-۱۱-۱۴
عبداللہ [illegible] ۹۰
عبدالکریم [illegible] ۱۸۰

Marfat.com

عبداللہ شاہ (رک بشیر) ۱۸۶
عبداللہ مولوی - ۱۴۳
عبدالواسع ہانسوی، ۲۰۱-۲۰۲
عبدالودود قاضی - ۷۵-۱۷۷
عزیز عبدالعزیز مولوی - ۲۲-۲۵-
۲۶-۱۵۵-۲۰۸
علوی عبداللہ خاں مولوی - ۳۱ تا
۳۴-۹۱-۱۳۲-۱۳۶-۱۴۳-۱۴۴
علی اکبر سید - ۳۳
عمر فاروق حضرت - ۱۱-۱۴
عنایت عنایت علی خاں - ۴۰
عیش رائے عزت سنگھ ۱۹۳
غالب - اسد اللہ خاں - ۸۰-۹۱ تا ۹۴
۱۳۳-۱۴۹-۱۵۲-۱۶۷-۱۶۹ تا
۱۷۵-۱۷۷-۱۷۸-۱۸۰-۱۸۲ تا ۱۸۵
۱۸۷-۱۹۱-۱۹۵-۱۹۷-۲۰۲
غریب غریب اللہ - ۱۹۳
غمگین بنارسی داس لالہ - ۲۷
فتح الملک بہادر ولیعہد - ۱۰۴-۱۷۵-۱۷۳
فتح سنگھ - ۹
فدا مرزا بلند بخت - ۱۹۳
فراق ناصر نذیر - ۱۴۷
فرحت اللہ بیگ مرزا ۱۲۵-۱۹۴-۲۰۶
فرخ سیر بادشاہ - ۳۹
فروغ محمد عمر سلطان - ۱۹۳

فریزر بہادر ایجنٹ دہلی - ۱۶۸
فغاں لال جی پرشاد پنڈت - ۱۹۳
فقیر شمس الدین میر - ۴۷-۷۷-۹۶
فولر صاحب کپتان - ۱۲۲
قادر علی مولوی - ۲۴-۲۰۷
قاسم قدرت اللہ حکیم - ۱۰
قاصر علی احسن، حافظ - ۱۹۴
قدسی محمد جان - ۳۳-۳۴
قلق سلطان خاں - ۱۹۳
قلق مولا بخش - ۱۵۰
قمیص شاہ (= قمیش) - ۱۰-۱۱
کام بخش مرزا شاہزادہ - ۱۶۷
کریم الدین مولوی - ۱۲-۱۳-۳۱-۳۷
۸۲-۸۸-۱۱۵-۱۱۷ تا ۱۲۳
۱۳۸-۱۴۳-۱۴۴-۱۴۶-۱۵۰
کوکبی ملا - ۱۰۴-۱۰۸-۱۰۹-۱۱۳-۱۱۴
گارسن دتاسی - ۲۲-۸۵ تا ۸۷-۱۰۲ تا
۱۰۴-۱۳۷-۱۸۷-۲۰۶
گیان چند پروفیسر ۹۰
مبتلا (رک اجودھیا پرشاد) - ۱۴۶
محسن لکھنوی - ۱۸
محمد اجمل، شاہ - ۳۳
محمد اسماعیل میرٹھی، مولوی - ۱۵۸
محمد بخش تھانیسری، مولوی ۱۲-۱۴-۲۴
۲۳-۲۵-۳۰-۳۸

Marfat.com

محمد حامد خواجہ، ڈاکٹر - ۳۷-۱۳۸-۱۵۵
۱۵۶-۱۸۱-۱۹۶-۲۰۲
محمد حمید الدین - ۲۱۱
محمد سعید قاضی - ۷۵
محمد شاہ بادشاہ - ۱۴۳
محمد صادق مولوی - ۱۳۰
محمد عباس شوستری، میر، مفتی - ۱۷۱
محمد علی خاں - ۲۰۷
محمد عمر سلطان (رک فروغ) - ۱۷۶
محمد عمر قاضی - ۳۳-۳۴
محمد غیاث الدین مولوی ۱۸۷-۱۸۹
محمود خاں شیرانی، حافظ - ۱۴۴-۱۴۵
۱۴۷-۱۵۱
محو غلام حسن خاں - ۹۲
محوی ارشاد احمد - ۱۹۳
محوی محمد بیگ - ۱۹۳
مرزا، مرزا نوشہ (رک غالب) ۹۵-۹۶
مصحفی - ۹۳
مصطفیٰ بیگ، مرزا - ۲۰۹
مظہر مرزا جانجاناں - ۱۳
مقتول امام علی، مولوی - ۲۰۲
مکرم بخت مرزا شاہزادہ - ۱۸۷
ممنون میر نظام الدین - ۸۶-۸۹-۹۲
۱۴۹-۱۹۰
مونچند - ۸۶
مومن حکیم محمد مومن خاں ۳۹-۷۸-۷۹
۸۶-۸۷-۹۱-۱۴۹-۱۵۰-۱۹۵
مہجور کرپا رام - ۲۱۱
میر محمد تقی - ۸۶-۸۹
نادر درگا پرشاد - ۱۶۰
نادر کلب حسین خاں، ڈپٹی - ۳۳-۴۰
ناسخ - ۸۶-۸۹-۱۹۰
ناظر حسن زیدی ڈاکٹر - ۱۵۰
نامی بلدیو سنگھ لالہ - ۱۴۸
نثار میر نثار علی - ۱۴۳-۱۴۴
نجم الدین شاہ - ۱۸۶
نجم الغنی خاں حکیم - ۱۳۸-۱۴۱
نذیر احمد مولوی - ۱۵۴
نساخ عبد الغفور خاں - ۱۶ تا ۱۹-۲۲
۲۳-۱۸۴ تا ۱۸۶-۱۸۸
نسیم محمد یعقوب ۱۹
نصر اللہ خاں حکیم - ۱۵-۱۹
نصیر شاہ نصیر الدین ۸۶-۸۹-۱۸۶-۹
نعمت اللہ شاہ قادری - ۱۰
نکہت حافظ غلام احمد - ۱۸-۲۰
نور الدین مرزا - ۱۶۷
نور حق شاہ محمد جمیل ۱۹۳
نور محمد قادری شیخ - ۲۱-۲۴
واضح ارادت خاں - ۹۴-۱۵۵
وحید قریشی ڈاکٹر ۱۷۷-۱۸۱-۱۸۹ تا ۱۹۱

Marfat.com

وزیر الحسن عابدی پروفیسر - ۱۶۳
وزیر الدین خاں ۲۴ - ۲۵ - ۲۹ - ۳۱۰
ولی - ۸۶
ہجر محمد حسین مولوی ۱۴۴ - ۱۴۲ -
۱۶۳ - ۲۰۴
ہرنراین پنڈت - ۱۹۴
یوسف مولانا - ۱۹۲

ب - کتب و رسائل وغیرہ

آب حیات ۱۷۲ - ۱۷۳
آثار الصنادید - ۱۵ - ۳۷ - ۱۲۴ تا ۱۳۳
۱۳۵ - ۱۵۳
آئین اکبری ۳۷ - ۹۶ تا ۱۹۹
احقاق الحق ۱۶۱ - ۱۶۲
اعلاء الحق - ۱۶۲
انتخاب دواوین شعراء ۸۵ تا ۹۱ - ۹۳
۹۶ - ۱۰۴ - ۱۱۹ - ۱۴۹ - ۱۸۲ - ۱۸۹ - ۱۹۰
انتخاب رغمی - ۳۳
انشائے مکاتیب ۱۳۴ - ۱۴۷ - ۱۴۸ - ۱۹۷
بحر الفصاحت - ۱۳۸ - ۱۳۹
برہان قاطع - ۱۷۸ -
بستان تفاسیر - ۱۳۰
بہارستان تخیل - ۳۷
بیاض شوق پیام - ۳۷ - ۱۱۰ - ۱۳۴
۱۵۴ - ۱۹۶ - ۱۹۷
بیاض گلزار خلیل - ۱۱۰
پنج آہنگ - ۱۶۹
پنج رقعہ - ۹۴ - ۱۵۶
پیام یار رسالہ - ۱۹۴
تحقیق دوایر - ۱۶۴
تذکرہ اہل دہلی - ۱۳۱
تذکرۂ بشیر - ۱۸۷
ترجمہ حدائق البلاغت - ۳۹ -
۶۴ - ۷۵ - ۸۱ - ۸۴ - ۸۹ - ۹۶
۹۸ - ۱۰۴ - ۱۳۰ تا ۱۲۲ - ۱۳۷ تا
۱۳۹ - ۱۴۱ - ۱۶۱ - ۱۷۴
تشہیر ظہوری - ۱۲۲
تعریف روضہ - ۳
تکریم ظہوری - ۱۲۲
تنبیہ الغافلین - ۱۶۱ - ۱۶۳
جلوۂ داغ - ۱۹۵
جواہر منظوم رسالہ - ۱۰۹
حدائق البلاغہ - ۹۶ - ۱۴۱
حدیث قدسی - ۳۳
حدیقۂ رحمت ۱۶ -
حلل مطرز - ۱۰۸
حل مقامات عبد الواسع ہانسوی ۲۰۱
حلیۃ الحلل ۱۰۸
خلاصۂ دیوانہا (خلاصۂ دواوین -
رک انتخاب دواوین) ۸۶ - ۸۷

Marfat.com

سخن شعرا - ۱۸۶
سدا بکھر ہندی - ۹۸
سرنثر ظہوری - ۱۱۰-۱۱۱-۱۵۲
سید الاخبار - ۸۲ - ۱۰۲
شرح الفاظ مشکلہ ٹیک چند بہار ۱۳۶ - ۱۳۷
شرح توان خلیل - ۱۱۱
شرح جمال - ۱۵۵
شرح دیباچہ نورس - ۱۱۱
شرح رقعات (ظہوری) ۱۵۸
شرح سرنثر ظہوری ۱۱۰-۱۱۲-۱۲۲ ۱۲۷ - ۱۵۶
شرح گلزار ابراہیم - ۱۱۱
شرح معمائے نفیرائے ہمدانی ۱۲-۲۱
شرح ۱۰۸ آیات ۱۶۳
شرح مینا بازار ۱۵۵ تا ۱۵۸
شکایت ننگ ۶۶
شوکت بخارائی مثنوی - ۱۶۹
صفیر بلبل - ۳۴
طبقات شعرائے اردو ۱۳۶
ظہور کلیم ۲۷
ظہوری ۱۰۸
عبارات ۱۱۳-۱۱۴-۱۱۹-۱۲۰
عبارات ہندی - ۱۶۱
عجائب ۲۱۱
غنچہ کجاوہ - ۱۸۸
خسرہائے غزل قدسی - ۲۰۵
خوان خلیل - ۱۱۰
خونابشتاب - ۱۸۱-۱۸۲
دافع ہذیان - ۱۷۹
دستور معمار سالہ - ۱۰۸
دفع الوساوس مثنوی - ۱۳۷-۱۹۷
۱۷۱-۱۹۶-۱۹۹
دہلی کی آخری شمع ۲۶
ذہ مخزن کتاب - ۱۵-۱۶
دیباچہ بیاض اشراق - ۱۹۷-۲۰۳
دیوان ذوق ۱۴۷-۱۹۴
دیوان صہبائی ۲۰۴
دیوان غریب ۳۳
دیوان نظامی - ۱۵۰
رسالہ تذکرات ۸۶-۸۷-۱۸۶
رسالہ توابع و ضروریات فوائد ۱۰۲-۱۰۴ ۱۳۷
رسالہ گلزار سخن - ۱۵۴
رسالہ مناقشات سخن - ۲۰۲
رسالہ نادرہ ۱۰۶ - ۱۰۷ - ۱۱۳
رسالہ نوادر ظہوری ۱۵۴ - ۱۵۰
رقعات ظہوری (رک بہ رقعہ) ۱۵۶
شنیدہ دور - ۱۸۱
صادق ۱۵۸ - ۱۶۰ - ۱۸۳

Marfat.com

غوامض سخن - ۲۰۳
قاطع برہان - ۱۷۷ تا ۱۷۹ -
۱۸۱ - ۱۸۲
قصص الانبیا - ۱۸۴
قطعہ منتخب - ۱۸۵ - ۱۸۶
قواعد اردو (رک رسالہ قواعد صرف و نحو اردو)
۱۰۳ -
قول فیصل - ۸۰ - ۱۴۴ تا ۱۳۶ - ۱۶۲ - تا
۱۶۴ - ۱۷۸ - ۱۹۴
کافی در علم قوافی - ۱۵۷ تا ۱۶۰ - ۱۹۰
کلیات صہبائی - ۸۰ - ۹۱ - ۱۳۴ - ۱۴۷
۱۴۸ - ۱۵۹ - ۱۶۰ - ۲۰۱ - ۲۰۳
گلدستۂ نازنیناں - ۱۱۵ تا ۱۱۸
گلزار ابراہیم تذکرہ - ۸۹
گلستان بیخزاں - ۹
گلستان سخن ۲۶ - ۱۴۸ - ۱۵۹ -
۱۷۶ - ۱۷۷ - ۱۸۱ - ۱۸۲ - ۱۸۵
۱۸۶ تا ۱۹۱
گلشن بیخار - ۳۷ - ۸۹ - ۹۱ - ۹۳
گنجینۂ رموز - ۱۰۷ تا ۱۱۰ - ۱۱۳
مثنوی شیعیان علیؓ - ۱۷۰ - ۱۷۱
محرق قاطع - ۱۷۹
مخزن اسرار - ۱۱۳ - ۱۳۸
مخزن الشعراء - ۱۸۴
مرآۃ العروس ۱۵۴
معمائے اصغر - ۱۰۸
معمائے ہفصد ۱۳۸
مؤید برہان - ۱۷۹
مینا بازار ۹۴ - ۱۵۴ تا ۱۵۶
نالۂ بلبل - ۱۶
نامۂ غالب - ۱۸۳ - ۱۸۴
نتائج الافکار - ۲۰۰ - ۲۰۱
نظم آخریں - ۳۳
نفیسی ۳۱ -
نقوش مجلہ لاہور - ۱۶۳
نورس - ۱۱۰
وافی شرح کافی - ۱۵۹ - ۱۶۰ - ۱۹۰
ہدایت البلاغت - ۷۵

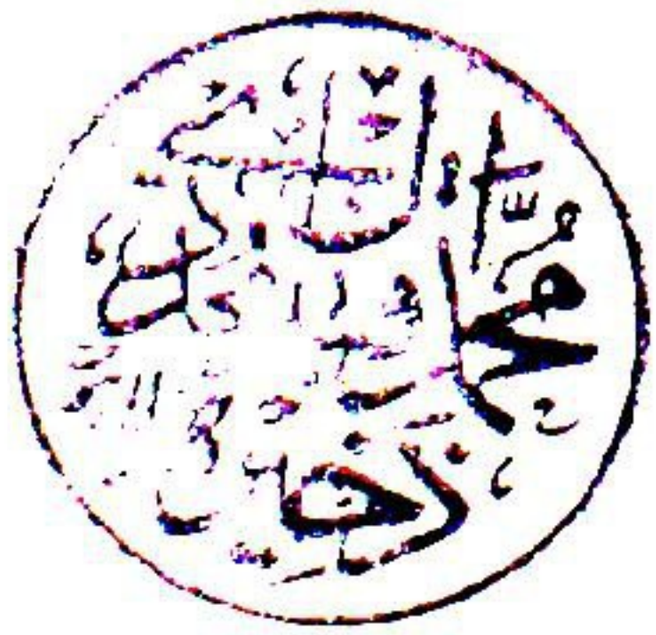

Marfat.com